مجلّہ

غالب نامہ

اردو میں علمی، ادبی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مُدیرِ اعلا : پروفیسر نذیر احمد

مدیران :

رشید حسن خاں

پروفیسر عبدالودود اظہر

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مجلہ غالب نامہ نئی دہلی

جلد ۲۹ ——————— شمارہ ۱

قیمت: ۵۰ روپے

ناشر و طابع: شاہد ماہلی

مطبوعہ: عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون: ۲۳۲۱۶۵۱۸، ۲۳۲۱۶۵۸۳

اداریہ

غالب نامہ کا موجودہ شمارہ بین الاقوامی غالب سیمینار کے انعقاد کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ اس میں غالب کے دو ماہرین پر جو اب ہم میں موجود نہیں، دو مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔

قاضی عبدالودود ایک مثالی محقق تھے اور قاموسی شخصیت کے مالک۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور حافظہ بے پناہ۔ فارسی سے قطع نظر اردو ادب کے مختلف موضوعات پر انھوں نے سیکڑوں مضامین لکھے۔ مصحفی، انشا، میر، سودا، محمد حسین آزاد، شاد، عبدالحق وغیرہم پر ان کے مضامین اگر علیحدہ علیحدہ جمع کیے جائیں تو متعدد کتابیں بن جائیں۔ ان کا مرتب کردہ دیوان جوشش انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا اور شاہ کمال علی کمال، میر ضیا، رضا عظیم آبادی کے دواوین انھوں نے مرتب کر کے رسالہ معاصر میں چھپوا دیے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی متعدد تصانیف و تحریرات شائع ہوئیں۔ لیکن جس پر ان کی توجہ و عنایت بے پایاں رہی وہ غالب ہیں جن سے ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ انھوں نے سب سے زیادہ مضامین غالب و متعلقات غالب پر لکھے ہیں۔ جو ہندوستان، پاکستان کے رسالوں میں شائع ہوئے اور جن سے دنیا برابر مستفید ہو رہی ہے۔

پروفیسر مختارالدین احمد نے ان کے تعلقات مراسم قدیم اور گہرے رہے ہیں۔ وہ ان سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، ایسے لوگ اب ہم میں شاذ ہیں۔ ان کی تحریرات جس شوق اور توجہ سے انھوں نے دیکھی ہیں۔ کم لوگوں نے دیکھی ہوں گی۔ ان کی تحقیقات علمیہ پر قاضی صاحب کی گہری چھاپ ہے گو انھوں نے اپنا اسلوب بیان اور طرز نگارش جداگانہ رکھا ہے۔

پیش نظر مضمون، قاضی صاحب کے مطالعۂ غالب کے سفر کی دلچسپ روداد ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب پر ان کے چار ابتدائی مضامین اِکھی کی توجہ اور علی گڑھ میگزین کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ مضمون " غالب نے اُردو میں خط کتابت کب شروع کی " اسی زمانے میں علی گڑھ میگزین کے لیے انھوں نے لکھا تھا جو بوجوہ اس میں نہ چھپ سکا۔ قاضی صاحب نے پروفیسر مختارالدین احمد کے زیر ترتیب مجموعے گنجینۂ غالب کے لیے "غالب اور عرفی" لکھا اور تبصرۂ "سبد چین" (مرتبہ مالک رام) پر اپنی نظرثانی و اضافات کیے۔ یہ دونوں تحریریں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ انشاءاللہ غالب نامہ کے آئندہ شمارے میں شائع ہوں گی۔

پروفیسر مختارالدین احمد کے مضمون بلکہ استدراک کی بھی کتابت ہو چکی تھی اور اداریے کی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں جب ان کا ایک رقعہ پہنچا کہ انھیں قاضی صاحب کے ایک اور مضمون کا علم ہوا ہے۔ یہ " آغا احمد علی اور غالب" ہے جس کی دو قسطیں رسالۂ تحریک (دہلی) کے نومبر ۱۹۶۵ء اور جنوری ۱۹۶۶ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح غالب و متعلقات غالب پر قاضی صاحب کے مضامین کی تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔

مالک رام اردو کے ممتاز محقق، مصنف اور انشاپرداز تھے۔ ان کی علمی ادبی اور تحقیقی کاوشوں کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے، لیکن ان کی زیادہ تر توجہ غالب اور عہدِ غالب کی طرف رہی۔ ان کا شمار ان ماہرینِ غالبیات میں ہوتا ہے جن سے اردو دنیا نصف صدی سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ ذکر غالب، تلامذۂ غالب، فسانۂ غالب، گفتار غالب ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے غالب کی متعدد تصانیف سبد چین، دستنبو، گل رعنا، خطوط غالب، دیوان غالب نہایت اہتمام سے مرتب کر کے شائع کیں۔ کلیات غالب فارسی کا متن انھوں نے نو قلمی اور دو قدیم مطبوعہ نسخوں کی بنا پر بڑی محنت و جاں فشانی سے مرتب

کیا ہے۔ افسوس کہ بعض وجوہ کی بنا پر یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ غالب کے عہد پر بھی ان کا کام بہت وقیع ہے۔ انھوں نے غالب کے ممدوحین، معاصرین، احباب، تلامذہ ان کے عقیدت مندوں اور مخالفوں پر بھی سینکڑوں صفحات لکھ کر بیش قیمت معلومات فراہم کیے ہیں۔

مالک رام نے ۱۹۲۶ء سے غالب پر لکھنا شروع کیا اور آخر زندگی تک وہ اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ اس ساٹھ پینسٹھ سال کے عرصے میں انھوں نے غالب اور متعلقات غالب پر ہزاروں صفحات لکھے جو اردو، فارسی دنیا میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے غالب پر، مالک رام کے بعض اہم مضامین پر تبصرہ کیا ہے، ان کے طرز استدلال و انداز تحقیق پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی اہمیت واضح کی ہے۔

ایک مقالہ منصور حلاج پر ہے، منصور کا اصل نام حسین بن منصور ہے، وہ انا الحق کی تلمیح سے جانے جاتے ہیں، اردو اور فارسی ادب میں منصور اور انا الحق کی تلمیح بہت عام ہے، ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی نے عبداللہ انصاریؒ کی کتاب طبقات الصوفیہ کی روشنی میں ان کا تعارف کرایا ہے، عبداللہ انصاری ۳۹۶ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں ۴۸۱ھ میں وفات پائی، طبقات الصوفیہ کی اہم ماخذ عبدالرحمٰن سلمی متوفی ۴۱۲ھ کی کتاب طبقات الصوفیہ عربی میں تھی، لیکن اب اس کی اصل نہیں ملتی۔ عبداللہ انصاری کی فارسی کتاب سے اس کے مندرجات کا پتا لگایا جا سکتا ہے، حسین منصور پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور وہ ۳۰۹ھ میں مقتول ہوئے۔ یعنی سلمی کی وفات کے ٹھیک ۱۰۳ سال قبل، اس حساب سے سلمی کی طبقات الصوفیہ اور عبداللہ انصاری کی طبقات حسین بن منصور کی زندگی کا اہم مآخذ قرار پاتی ہیں۔ ڈاکٹر شیروانی نے اس قدیم ماخذ کی روشنی میں حسین بن منصور کی حیات اور تعلیمات کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔

راقم حروف کا مقالہ ترنج زردست افشار پر ہے، زردست افشار طلائے

مشت افشار اور طلاے دست افشار کی صورت میں بھی ملتا ہے، غالب کے اشعار میں ترنج زر اور طلاے دست افشار کے فقرے نظم ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ ساسانی فرمانروا خسرو پرویز (وفات ۶۲۸ء) کے خزانے میں سونے کا ایک ڈلا تھا جو اتنا نرم تھا کہ جب وہ اسے ہاتھ میں لیتا تو اس کو دبا کر جو شکل چاہتا بنا لیتا، اس نے اس ڈلے سے ترنج بنا رکھا تھا۔ بعض روایتوں میں نوشیرواں اور دوسرے اور ساسانی حکمرانوں کی طرف اس کو منسوب کرتے ہیں۔ اس روایت کا ذکر ساسانی دور کی بعض تاریخوں میں ملتا ہے اور فارسی شاعری میں یہ واقعہ اتنا عام ہے کہ بیسیوں شاعروں نے اس تلمیح کو مختلف انداز میں استعمال کیا ہے۔ غالب نے "آم" کو اسی کی زردی کی مناسبت سے ترنج زر کہا ہے اور اس سے بہتر قرار دیتے ہوے ایک شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے، راقم نے اس روایت کو تاریخ اور فارسی اشعار کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی ہے، اس تلمیح کی اصلیت جاننے کے بعد غالب کے اشعار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے گا۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں، انھوں نے غالب کی شاعری میں شعلے کے رمز پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے، مجھے اُمید ہے کہ اس مقالے سے غالب کے افکار اور شعری نکات کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی بڑی تاریخی و تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں، انھوں نے اپنے مقالے میں غالب کے دور کے فارسی ادب پر عمدہ بحث کی ہے، غالب بلاشبہ اپنے دور کے سب سے ممتاز فارسی شاعر و ادیب تھے، قاسمی صاحب کے مقالے سے غالب کی فارسی نظم و نثر کے جائزے میں مدد ملے گی۔

نذیر احمد

فہرست

پروفیسر مختار الدّین احمدؒ

غالب اور قاضی عبدالودود

"مجھے یاد نہیں کہ کس طرح حسرت موہانی کا اردوئے معلّیٰ میں نے دیکھا اور اس کے کئی پرانے مجلّدات منگوائے اور ان میں شعرائے اردو سے متعلق جو مضامین تھے، پڑھے۔ شعرالعجم کی جلدیں بھی دیکھیں۔ بعد کو مجھے غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے اتنی بار اس کا دیوان دیکھا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے یاد ہو گیا تھا۔ جب غالب سے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے فارسی زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا... کسی قدر پہلوی بھی سیکھی... "غالب بحیثیت محقق" کم و بیش ۲۵۰ صفحوں کا مقالہ ہے جو "نقد غالب" مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد میں شامل ہے۔ "جہانِ غالب" کے عنوان سے میں نے دو ڈھائی سو صفحے لکھے ہوں گے۔ یہ غالب انسائیکلوپیڈیا اگر مکمل ہو جائے تو ہزار صفحوں سے کم کی نہ ہو مگر اس کی تکمیل کی بالکل امید نہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ غالب نے فارسی اور اردو میں "برہان قاطع" کے متعلق جو رسالے لکھے تھے، میں نے شائع کر دیے ہیں۔ ارادہ تھا کہ ایک دوسری جلد میں اس کتاب کے مباحث سے مفصّل بحث کی جائے، مگر اب تک یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا۔"

(قاضی عبدالودود: "میں کون ہوں میں کیا ہوں" مشمولہ معاصر قاضی عبدالودود نمبر)

قاضی عبدالودود صاحب اگرچہ کیمبرج میں معاشیات کے طالب علم تھے اور اسی میں ٹرائی پوس کر رہے تھے لیکن چوں کہ عربی و فارسی سے واقف تھے اور اُردو سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لیے انگلستان کے دورانِ قیام میں وہ اپنا فاضل وقت فارسی اور اُردو کے مخطوطات کے مطالعے میں صرف کرتے رہے۔ کیمبرج میں انھیں وہاں کے فاضل اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والوں سے ملنے جلنے کا مواقع بھی ملے۔ ان کے دوستوں میں ڈاکٹر محمد زبیر صدّیقی، ڈاکٹر محمد نظام الدّین اور کچھ ریسرچ اسکالرز تھے جو پروفیسر براؤن اور دوسرے اساتذہ کی نگرانی میں علمی تحقیقات میں مصروف تھے۔ کیمبرج کی علمی فضا اور ان اصحاب کی صحبت نے اگر قاضی صاحب کے شوقِ تحقیق کے لیے مہمیز کا کام کیا ہو تو عجب نہیں، انھوں نے قدیم اردو ادب بالخصوص شعرا کے تذکرے اور قدما کے دواوین

کا مطالعہ اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ فارسی اور اردو کے متعدد مخطوطات پر ان کے جامع نوٹس اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

فارسی زبان و ادب کا باضابطہ مطالعہ تو انھوں نے بہت بعد کو شروع کیا لیکن جیسا کہ ذکر ہوا اردو زبان و ادب سے ان کی دلچسپی یورپ جانے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ وہ انجمن ترقی اردو بہار کے اہم رکن تھے، کلامِ شاد کی ترتیب و اشاعت میں ان کا بڑا حصہ رہا (اس کی طباعت کے اخراجات بھی انھی نے ادا کیے تھے) اور اردو ادب کی تاریخ پر ان کی نظر اتنی ہو گئی تھی کہ جب پروفیسر محمد محفوظ الحق مرحوم نے رسالہ معارف میں گارسین دتاسی کی "تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی" پر ایک تعارفی مضمون لکھا تو قاضی صاحب نے بعض امور کی تردید میں اسی رسالے میں ایک مضمون لکھ کر شائع کرایا، یہ کوئی نومبر ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

قاضی صاحب کی یورپ سے واپسی مارچ ۱۹۲۹ء کو ہوئی۔ رسالہ معیار انھوں نے مارچ ۱۹۳۶ء میں ایک باذوق ادیب اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے شرف عالم آرزو جلیلی (م ۱۹۴۲ء) کے تعاون سے شائع کرنا شروع کیا اور اسی رسالے سے جس کے صرف چھ شمارے شائع ہو سکے وہ ادبی دُنیا میں باضابطہ روشناس ہوئے۔ درمیان کے سات آٹھ سال کی ان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے مصحفی کے تذکروں اور دواوین کا مطالعہ شروع کیا اور آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں جو پٹنہ میں ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوا، انھوں نے مصحفی کی حیات و تصانیف پر ایک مفصل تحقیقی و تنقیدی مقالہ سپردِ قلم کر کے پیش کیا۔ افسوس ہے کہ یہ قیمتی مقالہ آج تک شائع نہ ہو سکا۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ اس کے کچھ اوراق باقی بچ گئے تھے، آجکل وہ بھی گم ہیں۔

اسی زمانے میں جوشش عظیم آبادی (م ۱۲۳۶ھ) کے اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ انھیں دستیاب ہوا۔ کلام کا انتخاب انھوں نے اواخر ۳۵ء میں کیا جو رسالۂ اردو (جنوری ۱۹۳۶ء) میں چھپا۔ دیوانِ جوشش انجمن ترقی اُردو ہند کی طرف سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔

اس سات آٹھ سال کے عرصے میں ان کا کوئی اور مضمون شائع ہوا ہو تو ہمیں اس کی اطلاع نہیں، اس کا امکان ہے کہ کسی رسالے میں ان کا کوئی مضمون چھپا ہو جو عام طور پر مشہور نہ ہوا ہو۔

یہ کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا کہ غالب سے قاضی صاحب کی دلچسپی صحیح معنوں میں کب سے شروع ہوئی۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ معیار (پٹنہ) کی اشاعت سے پہلے وہ غالبیات کا مطالعہ شروع کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنا رسالہ مارچ ۱۹۳۶ء سے شائع کرنا شروع کیا، اس کا آخری شمارہ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا، ستمبر کا شمارہ مرتب ہو چکا تھا، کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔

اس رسالے میں مختلف عنوانات (معروضات، اقتباسات، استفسارات، مقالات، آثار ادبیہ، اوراق پارینہ، مطبوعات جدیدہ وغیرہ) کے تحت تحریرات و مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان عنوانات میں ایک عنوان "غالب" بھی تھا جس کے تحت انھوں نے حسب ذیل تحریرات شائع کیں:

مرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط ص ۱۵	منشی سیل چند (رام پور) کے نام تین خط جو انھیں دارالانشاء رام پور سے حاصل ہوئے۔
غزل مرزا غالب ص ۹۵	"اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں" از دیوان معروف مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں۔
مرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس ص ۹۵	احسن الاخبار بمبئی کے شمارۂ ۲۵ جون اور ۲ جولائی ۱۸۴۷ء سے غالب کی گرفتاری کے متعلق اطلاعات
اشعار غیر مطبوعہ ص ۱۴۳	تذکرۂ عمدۃ المنتخبہ از اعظم الدولہ سرور (نسخہ وزارت ہند لندن) سے ۱۴ متفرق اشعار۔
پنج آہنگ ص ۲۲۱	مطبوعہ دارالسلام دہلی ۱۸۵۳ء کا تعارفی نوٹ از قاضی عبدالودود۔
غالب کے دو لطیفے ص ۲۳۲	ماخوذ از پنج آہنگ

سرمایۂ سخن اور غالب ص ۳۳۴ — تذکرے سے غالب کا ترجمہ درج کیا گیا ہے اور ان کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ انطباع (۱۲۶۹ھ)

عالم ادب کے تحت :

مرقد غالب ص ۱۸۶

تذکرۂ سرور اور غالب ص ۳۲۵ — غالب کا ترجمہ اور سرور کے مختصر حالات

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین کے تحت :

غالب ص ۲۵۷ — طالب صفوی کے مضمون (مطبوعۂ رسالہ ہمایوں جولائی ۳۶ء) کا ذکر

غالب کی شخصیت ص ۲۶۰ — برج موہن دتاتریہ کیفی کے مضمون (مطبوعہ ادبی دنیا لاہور مارچ ۳۶ء) کے اقتباسات

استفسارات کے تحت :

غالبیات کے سلسلے کی کچھ کتابیں — از منشی مہیش پرشاد

غزل "دامانِ نگہ تنگ ... گلہ دارد" کس کی ہے ؟ — از قاضی عبدالودود۔

قاضی صاحب سے غالب پر مستقل مضامین لکھوانے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی[۱] جنھیں میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان سے علی گڑھ میگزین کے لیے لکھوائے پہلے مضمون کا عنوان تھا : "غالب کی راست گفتاری"، یہ مضمون ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے مکمل کر کے مجھے بھیجا اور ۴۹ ۔ ۴۸ء کے میگزین میں شائع ہوا۔ اس میں جو مباحث آئے ہیں اور جن مصادر (لطائف غیبی، کلیات نثر فارسی، کلیات نظم فارسی، غیاث اللغات، تیغ تیز، شمشیر تیز تر، موید برہان، فرہنگ جہانگیری، درفش کاویانی، برہان قاطع، قاطع برہان،

[۱] اس سے پہلے ان کا لکھا ہوا صرف ایک تبصرہ "خطوط غالب" مرتبہ منشی مہیش پرشاد پر رسالۂ معاصر (پٹنہ) میں شائع ہوا تھا اور ایک مضمون رسالۂ مصنف (علی گڑھ) میں۔

محرق قاطع برہان، نہر الفصاحت (قتیل) کلّیات شہید، المعجم فی معاییر اشعار العجم، کلیات ابن یمین) کا ذکر انھوں نے کیا ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ برسوں سے اس موضوع کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور غالب کی بیشتر فارسی و اردو تصانیف، قاطع برہان کے سلسلے کی موافق و مخالف کتابیں اور فارسی کے اہم متون ان کی نظر سے گذر چکے ہیں، یہ ایک چونکانے والا مضمون تھا اور اس کی اشاعت پر مثبت اور منفی دونوں رائیں مجھے موصول ہوئیں؛ مثبت کم اور حسب توقع منفی زیادہ۔

اسی زمانے میں مجھے علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر شائع کرنے کا خیال ہوا، میں نے اصرار کرکے ان سے چار مضامین لکھوائے: "غالب کا ایک فرضی استاد" (تاریخ تحریر ۴ مارچ ۱۹۴۹ء) غالب بہ حیثیت محقق (۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء) مآثر غالب (۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء) اور تبصرۂ فرہنگ غالب (۱۵ جولائی ۱۹۴۹ء) اس طرح غالب سے متعلق ان کے پانچ مضامین علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئے۔ انھوں نے "سبد چیں" (مرتبہ مالک رام) پر تبصرہ بھی دراصل میگزین کے لیے لکھا تھا۔

(۱) غالب کی راست گفتاری

اس مضمون کی ابتدا حسب ذیل سطور سے ہوتی ہے:

"غالب کے دوست ہوں یا دشمن اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ غالب نے خودستائی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ صوری اور معنوی محاسن میں سے کم ایسے ہیں جن کا وہ اپنی ذات کو جامع نہ سمجھتے ہوں۔ اپنی جن خوبیوں کو انھوں نے اجاگر کرکے دکھایا ہے ان میں راست گفتاری بھی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے[1]:

"میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا"۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں[2]:

راست گفتارم و یزداں نہ پسندد جز راست — حرف ناراست سرودن روش اہرمن است

---

[1] اردوئے معلی (مطبع کریمی لاہور) ص ۳۷۰

[2] کلیات نظم فارسی (طبع سوم لکھنؤ) ص ۲۰۸

اپنے متعلق غالب کے اس دعویٰ کو ان کے کل سیرت نگاروں نے بہ استثنائے بعض قبول کر لیا ہے۔ حالی، غلام رسول مہر اور امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے اقوال ملاحظہ ہوں:

" وہ روایت اور حکایت وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے[1]"

" واللہ الحمد کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند، ہر چہ در دل داشتم بہ زبان باز گفتم، ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آگئی ہے[2]"

"لغو گوئی سے پرہیز.... جھوٹ اور تکلف سے نفرت.... اُن کا شعار تھا[3]"

مَیں یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ انسان کے لیے ہر حال میں سچ بولنا ضروری ہے یا نہیں، میری غرض صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب کا دعویٰ کہ "کبھی جھوٹ نہیں بولتا" کہاں تک صحیح ہے۔

اس تمہید کے بعد قاضی صاحب نے غالب کے خلاف ۱۸ دفعات قائم کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ غالب نے یہاں یہاں حقیقت سے انحراف کیا ہے۔ ان میں ۸ دفعات یعنی ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ بعض فارسی، اردو الفاظ کی تحقیق اور اس کے مسائل سے متعلق ہیں جن میں بقول ان کے صحیح صورت حال واضح نہیں کی گئی ہے اور غالب نے وہ مطالب نکالے ہیں جو اُن کے مفید مطلب ہیں۔ کتابوں سے ایسی عبارتیں اور اشعار نقل کیے ہیں جن کا ان میں وجود نہیں، یا اس طرح نہیں ملتے ہیں جس طرح غالب نے پیش کیے ہیں۔

مثال کے طور پر غالب تیغ تیز میں آغا احمد علی مؤلف مؤید برہان کے ایک فارسی فقرے

---

[1] یادگار غالب (انوار احمدی الہ آباد) ص ۹۲

[2] غالب مصنفہ غلام رسول مہر، اشاعت دوم ص ۳۴۶

[3] دیباچہ مکاتیب غالب از امتیاز علی عرشی۔ اشاعت دوم ص ۲۱

میں اعتراض وارد کرتے ہیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں: مصنفِ مؤید [برہان] کے قلم سے ہرگز یہ فقرہ نہیں نکلا، یہ ان پر تہمت ہے... ... غالب شائد یہ سوچتے ہوں گے کہ اصل کتاب سے مقابلے کی زحمت کون گوارا کرے گا، اور تردید ہوئی تو کیا ضروری ہے کہ [تیغ] تیز کے کل پڑھنے والوں کی نظر سے گزرے، ان کی غرض مخالف کی تذلیل تھی اور وہ حاصل ہو گئی ہے۔" غالب، تیغ تیز ہی میں آغا احمد علی پر سرقۂ مضمون اور تغیر الفاظ کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں دال کو بالالتزام نقطے کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ "فرہنگ ہای پیشیں میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہ گار، ورنہ مولوی اٹھائی گیرا یہ راز [کہ قدماء دال کو بالالتزام نقطے کے ساتھ لکھتے تھے] مجھ سے ہزمرزوقم مولانا و اولنا حضرت مولوی عبد الصمد علیہ الرحمۃ نے کہا ہے، کوئی دوسرا اس کو نہیں جانتا تھا، ایسی نئی بات کو چرانا اور اپنا قول بتانا چوری اور سرزوری اور بے حیائی ہے یا نہیں:

"اے اہل عقل کوئی تو بولو خدا لگی" (تیغ تیز ص۱۱)

قاضی صاحب نے اس سلسلے میں دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر ایسی پرانی کتابیں موجود ہیں جن میں دال کو بالالتزام نقطے کے ساتھ لکھا ہے تو یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ عبد الصمد کے سوا کوئی دوسرا اس کو نہیں جان سکتا تھا۔" دوسری بات یہ کہ "عبارت کا جو مطلب مسروقہ بتایا جاتا ہے وہ صاحبِ مؤید [برہان] کی ہرگز نہیں، صاحبِ فرہنگ [جہانگیری] کی ہے۔ (فرہنگ ۱/۵۵) آغا احمد علی نے اس کے متعلق فرہنگ کی مکمل عبارت نقل کرنے سے پہلے یہ لکھ دیا ہے: "صاحبِ جہانگیری شیرازی چناں افادہ فرمودہ" اور اس کے خاتمے پر یہ الفاظ ہیں: "تم افاضتہ"۔ سرقے کا الزام خواہ وہ فرہنگ سے ہو یا قاطع سے، آغا پر کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا۔"

غالب، تیغ تیز میں اپنی کتاب درفش کاویانی (ص۱۵) سے لفظ "آہنگ" کی بحث کا خلاصہ لکھنے کے بعد رقم طراز ہیں: "مولوی جہانگیر نگری نے مؤید برہان کے ۸۲ اور ۸۴ صفحے کو سیاہی لیپ دیا ہے۔ بارہ معنی "آہنگ" کے لکھے اور ہر معنی کی سند میں ایک شعر...." اس سے معلوم ہوا کہ مولوی نے بہت فرہنگوں کو دیکھ کر دس بارہ شعر نقل کیے ہیں۔ یہ تو سب کچھ

ہوا لیکن میرے ... ... سوال کا جواب نہیں اور خرافات ہزار در ہزار۔"

قاضی صاحب فرماتے ہیں: "غالب کا یہ کہنا کہ آغا نے خارج از بحث باتیں بہت لکھی ہیں اور اصل اعتراض کا جواب نہیں دیا صحت سے بہت دور ہے۔ غالب نے قاطع میں صراحتہً لکھا تھا کہ "آہنگ" کے جو معانی برہان میں دیے ہیں ان میں سے بیشتر محتاج بہ سند ہیں، عبارت کا یہ ٹکڑا غالب نے تیغ میں نقل نہیں کیا اور یہ دیانت کے خلاف ہے۔ آغا، سند کے اشعار پیش کرنے میں بالکل حق بہ جانب تھا ... ... غالب غلط گوئی سے آغا کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔"

غالب تیغ [تیز] میں "دیدۂ عیب ساز" پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں کہ گویا یہ الفاظ آغا کے ہیں حالانکہ وہ عبارت جس میں یہ الفاظ آتے ہیں مؤید میں صراحتہً مرقوم ہے (ص ۱۹، ۲۰) کہ برہان سے منقول ہیں۔

درفش کاویانی کے دیباچۂ جدید میں قاطع پر جو اعتراض ہوئے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم" (ص ۵) حالانکہ دو لفظوں کے متعلق نامۂ غالب میں خود انھوں نے اقرار کیا ہے کہ مجھ سے سہو ہوا ہے اور خود درفش سے بھی اس کا پتا چلتا ہے (ص ۲۵، ص ۹۴)۔ غالب کے ایک خط میں بھی جو عود ہندی (ص ۱۸۸) میں موجود ہے یہ عبارت ملتی ہے: "آویزہ اور افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ بے مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے۔"

اب الفاظ و لغات کی بحث سے صرف نظر کر کے کچھ اور امور پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ غالب، غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں: "ہاں بھائی میں از روی مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں، اب جو شخص پوچھا کرے صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے۔" (اردو ص ۱۷۴)۔

غالب کو خود اعتراض ہے کہ مصلحت ہو تو غلط گوئی جائز ہے۔

۲۔ غالب ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے تفتہ کو لکھتے ہیں: "میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے

ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔" (اُردو ص۱۷)

قاضی صاحب لکھتے ہیں: غالب نے صراحۃً یہ نہیں لکھا کہ اس وقت تک کچھ نقد نہیں ملا لیکن کنایۃً وہ اس سے انکار کرتے ہیں باوجود اس کے اصل رقم (ایک ہزار روپے) جو ملنے والی تھی وہ ۲۰ر اکتوبر ہی کو مل چکی تھی۔ رخصت کے وقت ایک مختصر رقم (دو سو روپے) بطور زادراہ ملی تھی۔ تفنتہ سے حقیقت کا اخفا اس لیے تھا کہ کہیں انھیں دینا نہ پڑے۔ وہ زردار آدمی نہ تھے اور اس کے باوجود آڑے وقتوں میں غالب کے کام آئے تھے۔

۴۔ شیونراین، غالب کا دیوان اُردو اپنے مطبع سے شائع کرنا چاہتے تھے، غالب نے ان سے وعدہ بھی کر لیا تھا، لیکن دیوان کا نسخہ میرٹھ کے ایک مطبع کو وہ پہلے ہی بھیج چکے تھے جس سے غالب اب ناخوش ہو گئے تھے۔ وہ شیونراین کو ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا" (اردو ص۲۸۴)

لیکن غالب، سیاح کو ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں اسی کے متعلق لکھتے ہیں:

" دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین آدمی نہیں بھوت ہے۔ پلید ہے غول ہے قصہ مختصر سخت نامعقول ہے مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔" (اُردو ص۱۲)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان واپس لینے کا کچھ اور سبب تھا۔ شیونراین کی دلجوئی مقصود نہ تھی۔

۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء والے خط بنامی شیونرائن میں یہ عبارت بھی ہے:

"رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا۔ ... تمھارا مال ہے۔"

اس خط میں یہ لکھا کہ دیوان، رام پور سے صرف شیونراین کے واسطے لائے تھے اور ۱۸۶۰ء میں انھیں اصل حقیقت بتا چکے تھے کہ دیوان ضیاءالدین احمد خاں کے لیے لکھوایا

اور انھیں رام پور سے دہلی بھیجا گیا تھا:

"اب جو میں دلّی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اُردو لے کر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ مَیں نے کاتب سے لکھوا کر ... ضیاء الدین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔ ... اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھ سے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کون کرتا ہے؟ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ مَیں۔ اب کہو میں کیا کرتا۔ دلّی آکر... دیوان بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟" (اردوئے معلّٰی ص۲۸۲)۔

غالب کا ایک قصیدہ، نصیر الدین حیدر شاہ اوراودھ کی مدح میں ہے جس میں ضمناً روشن الدولہ وزیر اودھ کی بھی تعریف ہے۔ اس کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

اس قصیدے کی نسبت تفتہ کو اگست ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بڑا مزا ناقصہ تم نے یاد دلایا ... یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپیہ بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ منظم الدولہ ... نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا... ... مَیں نے ناسخ کو لکھا کہ تم ... لکھو میرے قصیدے پر کیا گزری — انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے، تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ کر بھیجا کہ مجھے پانچ

رُپے بھی نہیں پہنچے .... یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ
کیا، آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیرالدین
حیدر مرگیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔" اُردوئے معلّیٰ ص۴۱)
یہ قصیدہ علاوہ اور نسخوں کے کلّیات کے دو ایسے نسخوں میں بھی موجود ہے جو غالب
کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ یہ دونوں نسخے کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور کی ملک ہیں؛ اس
قصیدے کا عنوان ان دونوں نسخوں میں یہ ہے:

"گزارشِ خیال لکھنؤ بسروبرگ ذریعۂ ایں قصیدہ و نگارش پذیرفتن
مدح شاہِ اودھ در جریدہ و بورقِ یادگار ماندن مدح بممدوح نارسیدہ
ازعالم مستی بہ بوئے بادۂ ناکشیدہ۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ قصیدہ ممدوح تک نہ پہنچا، صلے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا۔ متفرقاتِ غالب مرتبۂ مسعود حسن رضوی ادیب میں غالب کا ایک طویل
فارسی خط ناسخ کے نام ہے؛ اس میں عبارت ذیل ملتی ہے:

" این کہ لختے از عمر تلف نمودم و مدح شاہ اودھ سرودم آرایش
بساط این تمنّا بود .... چوں کار ساختہ نہ شد و زمزمۂ من بدل ہای تخت
شاہی فرود نیامد روی گرداندم و برخود دریغ خوردم۔ اکنوں من کجا و سفر ِ لکھن
کجا۔" (متفرقات ص۱۰۲)

غالب نے یہ خط ظاہر ہے کہ نصیرالدین حیدر کی موت سے پہلے لکھا ہے اس میں
بادشاہ کے صلہ دینے اور روشن الدولہ اور منشی محمد حسن کی خیانت کی طرف اشارہ بھی
نہیں۔ یہ حکایت کہ انعام ملا لیکن غالب تک نہ پہنچ سکا اختراعی ہے۔

۱۲۷۶ھ میں جب قاطع برہان تمام ہوئی تو دنیا کو پہلی بار اس کا علم ہوا کہ غالب
کا ایک استاد عبدالصمد بھی تھا۔ اس سے بہت پہلے جب ان کی عمر ۴۴ برس کی تھی وہ
ایک فارسی خط میں لکھ چکے تھے:

" در سخن از پرورش یافتگان مبدۂ فیاضم و سوادِ معنی را بہ فروغ گوہر

خویش روشن کردہ ام از ہیچ آفریدہ حق آموزیم بہ گردنم و بارِ منت رہنمایم بردوش نیست"۔ (کلیات نثر غالب)

حالی نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سُنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے اُستادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے"۔

(یادگار ص۱۴)

عبدالصمد اگر فرضی نام ہے تو جھوٹ ظاہر ہے، اگر واقعی اس نام کے کسی شخص سے فارسی سیکھی تھی تو انکار، راست گفتار آدمی کا کام نہیں۔

غالب کا یہ بیان کہ نواب یوسف علی خاں نے دوسو رُپے قاطع [برہان] کے چھپوانے کے لیے دیے تھے (اُردوئے معلیٰ ص۱۲)، میری رائے میں حقیقت کے خلاف ہے۔ اس واسطے نہیں کہ رام پور سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی (دیباچۂ مکاتیب غالب ص۱۲۸)، نہ اس لیے کہ قاطع [برہان] کی "تقریظ" میں غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں اسے خلافِ واقعہ "تقریظ" کی اس عبارت کی بنا پر سمجھتا ہوں جو نول کشور سے متعلق ہے۔ ریاست کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں، غالب رُپے پاکر یہ ہرگز نہیں لکھ سکتے تھے:

"اگراں جواں مرد ... بہ جستن شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ پرداختے، کاغذ مسودات قاطع برہان را... سرمہ فروش خریدے تا چکرہا ساختے"۔

غالب کے اور بیانوں کی تردید کے بعد اس مضمون کا آخری پیراگراف پیش کیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"غالب کے یہاں بالارادہ حقیقت سے انحراف کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں، لیکن اس مقالے کا خاتمہ غالب کے ایک بیان پر کیا جاتا ہے۔ جس میں دروغ گوئی کا اعتراف موجود ہے، لیکن یہ دروغ گوئی ایک دوست کی بھلائی کے لیے ہے۔ حسین مرزا کو لکھتے ہیں:

ابھی ... ... تمہارا قرض خواہ آیا تھا ... ... کچھ سچ کچھ جھوٹ
کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو رُپے تم کو بھیج دے ۔"
(اُردوے معلیٰ ص ۲۴۱)

قاضی صاحب کا یہ مضمون جو آج سے کوئی پینتالیس سال پہلے فروری ۱۹۴۸ء میں تحریر کیا گیا تھا، پھر کہیں دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ اور علی گڑھ میگزین کا یہ شمارہ جس میں یہ طبع ہوا، اب نہیں ملتا۔ طویل اقتباسات کی وجہ جواز یہی ہے۔

(۲) غالب کا ایک فرضی استاد

مُلّا عبدالصمد، غالب کے استاد تھے یا ان کا وجود خارج میں تھا اس بارے میں غالب کی زندگی ہی سے لوگوں کا اختلاف تھا، اور آج بھی یہ مسئلہ حتمی طور پر طے نہیں ہوا ہے۔

زمانۂ حال کے مصنفین میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"اُن کی فارسی تعلیم میں سب سے بڑا حصہ ایک نومسلم پارسی کا ہے، جس کا اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا، یہ فارسی اور عربی کا متبحر عالم تھا۔"

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"مُلّا عبدالصمد ہرمزد کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں، ہرمزد ۱۸۱۰ء کے قریب آگرے میں آیا تھا، وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا اور جب مرزا دہلی آئے تو وہ ہم رکاب تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہوگیا ہوگا یا مرزا میں اس کی دلچسپی بہت گہری ہوگئی ہوگی۔ اس کی صحبت سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہوگیا جو عموماً اہلِ زبان کا حصّہ ہوتا ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد غالب کے متخصصین میں نہیں لیکن غالب سے ان کی دلچسپی بہت گہری اور قدیم ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مُلّا عبدالصمد ایک غیر معمولی علم و استعداد کا آدمی تھا، بلا شبہ
مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا
دخل ہوگا، اور اس بارے میں وہ جو لکھتے ہیں حرف بہ حرف صحیح
ہے۔"

لیکن مولانا امتیاز علی عرشی ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں شاید پہلی مرتبہ
شک و شبہے کا اظہار کیا:

"اس میں شک ہے کہ عبدالصمد کوئی نومسلم پارسی اکبرآباد آیا اور
مرزا صاحب اس کے شاگرد ہوئے اور وہ دو برس میں انھیں فارسی گھُنا
کر چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کو خموش کرنے کے لیے مرزا نے یہ
نام دل سے گھڑ لیا تھا۔"

لیکن اس شبہے کی ابتدا تو غالب کے زمانے ہی میں ہو چکی تھی۔ غالب کے معاصر
اور حریف منشی سعادت علی مصنف محرق قاطع کے انکار ہی پر تو غالب نے 'لطائف غیبی' میں
میاں داد خاں سیاح کی زبان سے یہ کہلوایا ہے:

"ہاں، سچ ہے وہ [عبدالصمد] ایسا وجود خارجی نہیں رکھتا تھا کہ
ناصبی کے مترادف بالمعنی ہو، ساسان پنجم کی اولاد سے، رہنے والا یزد کا،
ایک امیرزادہ جلیل القدر جس نے پچاس برس علمائے عرب و بغداد سے
علوم عربیہ حاصل کیے اور طریقۂ زردشتیہ چھوڑ کر دائرۂ اسلام میں آیا، اور
پھر ہندوستان میں تشریف لایا، اور حضرت غالب سے ملا، اور دو برس
ان کا مہمان رہا، اس کو منشی جی منشی سعادت علی مصنف محرق قاطع کس
دلیل سے جھوٹ کہتے ہیں۔ نجم الدولہ (مرزا غالب) جھوٹ نہ بولیں گے،
ہاں بموجب اس مصرع کے:

کاذب ہمہ را بہ کیش خود پندارد

منشی جی آپ ویسا اور کو بھی سمجھتے ہیں۔" (لطائف غیبی ص ۲۹)

خیر منشی سعادت علی دہلوی تو غالب کے مخالفین میں تھے۔ ان کے تلامذۂ معتقدین میں حالی نے عبدالصمد کے بارے میں غالب کے اقوال کا تضاد دُور کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی یہ سُنا گیا ہے کہ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ حکیم غلام رضا خاں دہلوی گویا غالب کے متبنّٰی ہیں اور مرزا کے حالات سے بہت واقف، غیر مبہم الفاظ میں لکھتے ہیں: "صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اُردو۔ یہ جو مرزا صاحب ...... عبدالصمد کو اپنا استاد لکھتے ہیں، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا خارج میں نہ تھا۔"

حالی اور حکیم غلام رضا خاں کے بعد اس موضوع پر عرصے تک خاموشی رہی۔ زمانۂ حال کے غالب شناسوں میں غلام رسول مہرؔ، شیخ محمد اکرام، مالک رام عبدالصمد کے وجود خارجی کے قائل ہیں اور اسے غالب کا اُستاد سمجھتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام بھی انھی لوگوں میں ہیں۔ منشی مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس موضوع پر کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ مولانا امتیاز علی عرشی غالبًا پہلے غالب شناس ہیں جنھوں نے عبدالصمد کے وجود میں شک و شبہے کا اظہار کیا، قاضی عبدالودود صاحب اس معاملے میں منفرد ہیں کہ انھوں نے قطعیت کے ساتھ عبدالصمد کے وجود کا انکار کیا اور جو غالب کے اس دعوٰی کی کہ وہ "میرا اُستاد ہے اور" میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کیے"۔ پُرزور لفظوں میں تردید کی۔ انھوں نے یہ مفصّل مضمون "غالب کا ایک فرضی استاد" کے عنوان سے لکھا اس کی ابتدا ان سطروں سے ہوتی ہے:

"شاگرد کا استاد کے تلمذ سے انکار کوئی نادرالوقوع بات نہیں اور یہ بھی بہت ہوا ہے کہ مصلحتہً خلاف واقع کسی کی شاگردی کا اقرار کیا گیا ہو، لیکن اس کی مثال بہت کم ملے گی کہ کسی شخص نے کسی خیالی ہستی کو جس کی تخلیق کا وہ خود ذمّہ دار ہے، اپنا اُستاد قرار دیا ہو۔ سطور ذیل میں اس سوال سے بحث کی جائے گی کہ عبدالصمد، غالب کا زائیدہ تخیّل ہے، یا ایک اصلی شخص جس کے آگے ابتدا ہی میں انھوں نے

زانوے ادب تہ کیا تھا۔"
قاضی صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ۱۹ امور سے بحث کی ہے۔ مضمون کا اختتام سطور ذیل پر ہوتا ہے جس میں پوری بحث کا نچوڑ آگیا ہے:

"عبدالصمد غالب کا زائیدۂ فکر ہے اور بہت سی باتوں میں غالب کا مماثل ہے تو کچھ باتیں اس میں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو غالب میں نہیں ملتیں۔ غالب افراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی، غالب ہندوستان کے رئیس زادے ہیں تو عبدالصمد ایران کا امیرزادہ۔ پیشہ ور معلم دونوں میں سے کوئی نہیں، لیکن تلامذہ کی تربیت سے دونوں میں کسی کو انکار نہیں۔ ساسانِ ششم کا لقب دونوں ہی کے لیے وضع کیا گیا ہے ("ساسان ششم بہ کاروانی مائیم" دستنبو کی آخری رباعی کا مصرعۂ آخر)۔ عبدالصمد کی وہ خصوصیات جن سے غالب محروم ہیں وہ ہیں جن کا فقدان غالب بہ شدت محسوس کرتے تھے، یہ علوم عربیہ اور منطق و فلسفے میں دخل کلی ہے۔ غالب نے عبدالصمد کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اپنی کتابوں کے پڑھنے والوں کو اس کے وجود خارجی کا یقین پیدا کرنے کے لیے حکایتیں وضع کیں اور اس کے حوالے سے بہت سے نکات لکھے، لیکن ایک بات ان کے لیے ناممکن تھی، اور وہ ایسی شخصیت کی تخلیق تھی جس کی ذہنی سطح اُن سے بلند تر، اور جس کی معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں۔"

قاضی صاحب کا یہ مضمون غالب کا ایک فرضی استاد: عبدالصمد علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں ۱۹۴۹ء میں چھپا۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے اسے نظر ثانی کے بعد احوالِ غالب میں شمول کے لیے مجھے بھیجا۔ جنوری ۱۹۵۲ء کے نوائے ادب میں جناب مالک رام نے ایک مضمون میں قاضی صاحب کے اس خیال کی تردید کی کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا۔ قاضی صاحب کا جواب جو سات صفحات پر مشتمل تھا میں نے "احوالِ غالب" میں

ان کے مضمون کے بعد بطور استدراک شائع کر دیا تھا۔

(۳) غالب بہ حیثیت محقق

اس طویل مضمون کی جو علی گڑھ میگزین کے ۲۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ابتدا ان سطور سے ہوتی ہے :

"اور ظلم کے انواع ہیں ... ازاں جملہ ایک کتمان حق اور اعلان باطل بہ اصرار تیغ صہ"

غالب کے کلیات کا خاتمہ جس فخریہ رباعی پر ہوتا ہے، اس کی بیت آخر یہ ہے :

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آن دین را ایزدی کتاب ایں بودے صہ۵۱۷

فارسی شاعری کے روایات، نظم میں اس قسم کی تعلّی کو روا رکھتے ہیں، اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی لیکن جب نثر میں یہ کہا جائے کہ میں نے فارسی کی تحقیق کو اس پایے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں (خطوط: ۱۹۱)، یا جب اپنے سوا ہندستان کے کل فارسی داں بالاعلان غیر مستند قرار دیے جائیں (قاطع صہ۱۳۱)، تو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ دعوے حقیقت سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ غالب شاعر تھے اور بہت شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے ایک ہی شخص شاعر اور محقق بھی ہو۔ یہاں ان لوگوں سے بحث نہیں جو "پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا و پیش ہیچ ہر دو و پیش ہر دو ہیچ" کے مصداق ہیں۔ یہ حضرات بہ یک وقت سب کچھ ہو سکتے ہیں۔

دوسری یہ کہ غالب کی باقاعدہ تعلیم زیادہ نہیں ہوئی (مکتوب غالب بنام شمس العلماء ضیاء الدین خاں دہلوی) اور بعد کے ذاتی مطالعے سے جو استاد کی رہنمائی کے بغیر ہوا، ان کی بنیادی کمزوریاں دور نہ ہو سکیں۔

تیسری یہ کہ ان میں جو اعوجاج ذہن، ضعف حافظ، خود پرستی، ناتواں بینی،

بے پروائی، سہل نگاری اور ضد انتہائی درجے کی ہے، اور جن طبائع میں یہ خصوصیات پائی جائیں، انھیں تحقیق سے کچھ سروکار نہیں ہو سکتا۔

چوتھی یہ کہ غالب ان اخلاقی قیود سے بھی آزاد ہیں جن کی پابندی دلبستانِ تحقیق کا ابجد خواں بھی اپنے لیے لازمی سمجھتا ہے، ہندوستان کے مشہور فارسی داں عبدالرشید آرزو، وارستہ، بہار، قتیل اور صہبائی جو ان کے طعن و طنز کے زہر آلود تیروں کی آماجگاہ رہے ہیں، فارسی دانی میں ان سے بہ مراتب بہتر تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ادبی حیثیت سے وہ غالب کے مقابل نہیں۔ افسوس کی جگہ ہے کہ غالب نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی شاعری، ان کی انشا پردازی اور ان کی ظرافت انھیں زندگی جاوید بخشنے کے لیے کافی ہے اور ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جس کے لیے نہ وہ طبعاً موزوں تھے، اور نہ جس کے لیے انھوں نے کچھ زیادہ تیاری کی تھی۔

غالب اپنی زبان سے اپنے کو محقق اکمل اور ہمہ دانِ عدیم النظیر کہیں، اور اپنے منزّہ عن الخطا ہونے کا اعلان کریں، ان کے مدّاح انھیں "شہنشاہ ممالکِ علوم عربی و فارسی" کا لقب دیں لیکن ان کے معلومات اتنے قلیل، ان کے اغلاط اتنے مختلف الانواع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزم محققین کی صفِ نعال میں بھی ان کے لیے جگہ نکالنی مشکل ہے"۔
علی گڑھ میگزین غالب نمبر ص ۱۷۲۔

یہ مضمون بارہ فصول پر مشتمل ہے،

پہلی فصل میں ایران قدیم سے غالب کی عدم واقفیت کا ذکر ہے جس کی محققانہ واقفیت کے غالب صراحۃً نہیں تو کنایۃً مدّعی ہیں۔

دوسری فصل میں دساتیر کے بارے میں جسے غالب نے اپنا ایمان و حرزِ جان کہا ہے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس کے مندرجات سے نہ صحیح واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اس کے خاص الفاظ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

تیسری فصل میں بتایا گیا ہے کہ غالب فرہنگوں کے مندرجات، ان کے جامعین کے طریق کار اور ان کے زمانے سے بہت محدود واقفیت رکھتے تھے۔

چوتھی فصل میں کہا گیا ہے کہ غالب نے صاحب برہان کو ایسے امور کے لیے مورد اعتراض ٹھہرایا ہے جو اس نے نہیں لکھے ہیں، مخالفین غالب نے ان کی توجہ منعطف بھی کرائی لیکن انھوں نے اظہارِ افسوس درکنار ایک اعتراض بھی واپس نہیں لیا۔

پانچویں فصل میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایرانیوں کی نظم و نثر سے وہ کس حد تک واقف ہیں، فارسی ادب پر ان کی نظر کیسی ہے، شعرا سے وہ کس قسم کی واقفیت رکھتے ہیں، فارسی سے دوسری زبانوں کے تعلقات کی نسبت ان کے معلومات کا کیا عالم ہے۔ مختلف زمانوں، مختلف طبقات اور مختلف علاقوں کی فارسی سے وہ کس حد تک واقف ہیں۔ قواعد زبان سے متعلق ان کا علم کیسا ہے اور اشتقاق میں ان کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ اختصار کے باوجود یہ فصل ۱۲ صفحوں میں آئی ہے۔

چھٹی فصل میں غالب اور فنون ادبیہ کے تحت ان کی عروض دانی سے عدم واقفیت کا ذکر ہے اور حالی نے جو ان کی عروض دانی کا دعویٰ کیا ہے اسے بے بنیاد بتایا ہے۔

ساتویں فصل میں مختصر طور پر بتایا گیا ہے کہ منطق و فلسفہ و نجوم سے غالب کی واقفیت واجبی ہی واجبی ہے اور ان کے معلومات عامہ بھی بہت کم ہیں۔

آٹھویں فصل میں ان کی عربی دانی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: غالب نے کبھی عربی نہ جاننے کا اقرار کیا ہے اور کبھی اصطلاحی معنی میں کنایتہً اپنے کو عالم کہا ہے۔ ان کے مداح یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خاصی عربی جانتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف و نحو کی ان اصطلاحوں کے صحیح مفاہیم بھی نہیں جانتے جن سے مبتدی تک آشنا ہیں، وہ معمولی لفظوں کو بے محل استعمال کرتے ہیں اور عربی جملے یا ترکیبیں بناتے ہیں تو ان میں فاحش غلطی کرتے ہیں۔

نویں فصل میں اس بات کا اظہار ہے کہ ترکی زبان سے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے اس کی فرہنگوں کی طرف رجوع کرنے کا انھیں احساس نہیں ہوا، نتیجہ یہ ہے کہ بے بنیاد

باتیں ان کی زبان سے نکل جاتی ہیں اور تنبیہہ کے باوجود بھی انھیں واپس نہیں لیتے۔

دسویں فصل میں غالب کے بیان کہ میری اردو دوسروں کی بہ نسبت فصیح ہے، گفتگو کی ہے۔

گیارہویں فصل میں ان کے اسلوب بیان کا ذکر ہے۔

بارہویں فصل میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان کے قول و فعل میں منافات ہے۔ ان کے یہاں ایک قول اور دوسرے قول کے درمیان تناقض و تضاد بہ کثرت ملتا ہے۔ کہیں کہیں مطالب کی ترتیب منطقی نہیں، ضعف استدلال کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے اقوال کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو کسی طرح قبول نہیں کی جا سکتی۔ دوسروں کے اقوال میں تحریف سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان کے یہاں اخلاقی قیود سے آزادی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

اس طویل مضمون کے خاتمے کی مندرجہ ذیل سطور بہت اہم ہیں:

"مقالہ طویل ہو گیا لیکن بہت سے سخن ہاے "گفتنی" ناگفتہ رہ گئے اور بہت سے مطالب زبان حال سے شکوہ سنج ہیں کہ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے عجلت کا بُرا ہو کہ بعض جگہ حوالے نہ دیے جا سکے یا دیے گئے تو نامکمل، مگر حوالہ یا اس کی تفصیل طلب کی گئی تو بخوشی حاضر کی جائے گی، کچھ اعتراض غالب پر جو اس مقالے میں ہیں غالب کی زندگی ہی میں کیے گئے تھے، مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کا بالالتزام ذکر نہ ہو سکا۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ غالب یا مدّاحانِ غالب سے "قطع محبت" منظور نہیں، مگر غالب کے متعلق ہر دعویٰ بے دلیل قبول نہیں کیا جا سکتا۔"

"غالب بہ حیثیت محقق" کی دوسری روایت حذف و اضافات کے بعد ۴ مئی ۱۹۵۲ء کو مکمل ہوئی اور اسی سال نقد غالب میں شائع ہوئی۔ ۴۲ صفحات کا یہ مضمون اب ۲۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اصل مقالے کے بعد خاتمہ، تصحیح و اضافہ، پھر حواشی، اس کے

بعد تتمۂ تصحیح و اضافہ اور آخر میں غلط نامہ اور پھر تتمۂ غلط نامہ درج کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ حسبِ ذیل ۱۱ فصول پر مشتمل ہے، ایران قدیم، فرہنگیں، برہان قاطع، فارسی ادب، فارسی زبان، عربی، اردو، ترکی و مغلئی، توافق لسانین، فنون ادبیہ، اخلاق۔ حق یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اس مقالے میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ جو اصحاب پورا مقالہ نہ پڑھ سکیں، ان سے التماس ہے کہ وہ اس مقالے کی پانچویں فصل ضرور پڑھیں جو انھوں نے غالب اور فارسی زبان پر لکھی ہے، یہ سب سے طویل فصل ہے جو ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) فرہنگِ غالب

یہ فرہنگ غالب مرتبہ جناب امتیاز علی عرشی پر قاضی صاحب کا لکھا ہوا ۱۲ صفحوں کا مفصل تبصرہ ہے۔ اس میں غالب کے اقوال کی صحت یا عدم صحت کی بحث بہت کم ہے، اس تبصرے کی اصل غرض یہ دکھانا ہے کہ جناب عرشی نے بہ حیثیت مرتب کے اپنے فرائض کس طرح انجام دیے ہیں۔

قاضی صاحب کا تبصرہ بارہ نکات پر مشتمل ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں درج کیا جائے۔

(۱) مرتب، مصنف کے اغلاط کی نشان دہی کر سکتا ہے لیکن اسے مصنف کا ایک نقطہ بھی بدلنے کا حق نہیں۔ فرہنگ میں اس مسلمہ اصول کی کہیں کہیں خلاف ورزی ہوئی ہے، اور بعض اندراجات غالب کے مدعا کے خلاف ہیں، اس کی قاضی صاحب نے ۱۳ مثالیں دی ہیں۔ (تفصیلات غالب نمبر صـ۲۵۶ ـ صـ۲۶۱ میں دیکھی جائیں)۔

(۲) کاف فارسی اور کاف عربی کے متعلق حواشی میں ذکر کرنا چاہیے تھا کہ غالب نے صراحۃً ان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

(۳) الفاظ کا املا غالب کے مسلک کے مطابق ہو یا نہیں اس کے متعلق مرتب کو ایک قاعدہ بنانا تھا اور اس پر عمل کرنا تھا۔

(۴) فرہنگ میں ایسی باتیں جنھیں نفس لغت سے کچھ سروکار نہیں، درج ہو گئی ہیں لیکن بعض لغات کے متعلق ضروری معلومات جو غالب کے یہاں موجود ہیں قابلِ

اندراج نہیں سمجھے گئے "

(۵) کہیں کہیں غالب کی کتابوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے مثلاً پتا نہ چل سکا کہ "کھرا" بمعنی دُرد، غالب کی کس کتاب میں ہے۔

(۶) کسی لغت کے متعلق غالب کے کُل بیانات یک جا نہیں۔

(۷) غالب کا مسلک یہ ہے کہ اصل لغت بالاستقلال فرہنگ میں مندرج ہو اور شعر کے تصرفات اگر قابلِ اعتنا ہیں تو ضمناً آئیں۔ فرہنگ کی دو حصوں میں تقسیم غالب کے الفاظ میں "زائد بات" ہے۔ دوسری اشاعت میں یہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ دو حصوں میں تقسیم سے جو خود جناب عرشی کا فعل ہے، بڑے مشکلات پیدا ہو گئے ہیں، اور وہ اُن سے اچھی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔

(۸) فرہنگوں میں لغات اس ترتیب سے درج ہونے چاہیں کہ ان کی تلاش میں دشواری نہ ہو،

(۹) فرہنگ غالب میں وہی مفردات و مرکبات درج ہونے تھے جن کے متعلق غالب نے کچھ لکھا ہے، پہلے یہ طے کر لینا تھا کہ کس قسم کی بحث لغت کو اس کا حق دار بناتی ہے کہ وہ فرہنگ میں شامل کی جائے۔ ایسا فیصلہ نہ ہونے کی وجہ سے بہ کثرت لغات جو قابلِ اندراج تھے فرہنگ میں جگہ نہ پا سکے اور کچھ جو اس قابل نہ تھے اس میں داخل ہو گئے (۱۴ مثالیں دے کر وضاحت کی گئی ہے۔ غالب نمبر صـ ۲۶۹ - صـ ۲۷۲)

(۱۰) وہ تمام معانی جنھیں غالب صحیح سمجھتے ہیں لازماً فرہنگ میں نہیں۔

(۱۱) حواشی میں غالب کے بعض اغلاط کی تعداد جن سے تعرض نہیں ہوا، کہیں زیادہ ہیں۔

(۱۲) حواشی میں بہت سی باتیں ہیں جن سے اختلاف کی گنجایش ہے یا جن میں اضافے کی ضرورت ہے، پانچ باتیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ (دیکھیے غالب نمبر صـ ۲۷۲ - صـ ۲۷۳)۔

تبصرۂ فرہنگ غالب انہی بارہ نکات پر مشتمل ہے۔ یہاں گویا عنوانات اور

سرنامے درج کیے جانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ مفاہیم و مندرجات کا کچھ اندازہ ہو سکے، ورنہ ہر مسئلے کے دلائل جس طرح قاضی صاحب نے دیے ہیں ان سے ان کی وسعت نظر، ان کا مطالعہ، اور ان کے طریقۂ استدلال و استنتاج پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

یہاں صرف دو تین مثالیں درج کرنا کافی سمجھتا ہوں:

(۱) قراب کے بارے میں غالب کہتے ہیں: "قراب (کذا) کون سا غریب لفظ ہے؟ خاقانی کے کلام اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے، قراب اور سداب دونوں لغت دونوں عربی الاصل ہیں" (اُردوے معلیٰ ص ۳۷۲)۔

فرہنگ میں قراب ضمے کے ساتھ ہے، بالکسر مندرج نہیں اور حاشیے میں مرقوم ہے کہ "میں نے جستجو کی تو قراب کے معنی ہم قدر اور ہم قیمت مل گئے"۔ قراب القاموس المحیط، لسان العرب اور دوسری عربی فرہنگوں میں قاف کی تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے سے پیشتر کہ غالب کے یہاں قاف کی حرکت کیا ہے، جناب عرشی کلیات خاقانی کی طرف رجوع کر لیتے تو ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا کہ اس میں قِراب بالکسر کم از کم پانچ جگہ آیا ہے، اور ایک جگہ بالضم یا بالفتح منظوم نہیں ہوا خاقانی کے ۵ مصرعے یہ ہیں:

تا از پے تیغ او قبضہ کنند و قِراب [دیوان ۴۴ طبع سجادی تہران ۱۳۳۸]
شمشیر سنجری ز قبضہ در قراب شد [دیوان ۱۵۷]
بہ تیغ صبح ز کیمخت کوہ کردہ قراب [دیوان ۵۲]
تیغ بر آتش را قراب رساد
کانسر شاہان کشید تیغ چو صبح از قراب [دیوان ۴۸]

دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی قِراب بالکسر بہ کثرت ملتا ہے، امامی ہروی کے دیوان (کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور) اور عرفی کے دیوان چھاندسے ایک ایک مصرع نقل کیا جاتا ہے: تیغ ہندی را زبان بفشرد در کام قراب

چوں تیغ کشند قراب تو بہ

قُراب بہ قاف مضموم یا مفتوح کسی ایرانی شاعر کے کلام میں میں نے نہیں دیکھا، صاحبِ بہارِ عجم کا قول یہ ہے کہ قُراب بالکسر ترکی ہے، مگر نہ تو یہ فضل اللہ کی ترکی فرہنگ میں ملا اور نہ لسان العرب وغیرہ میں اس کے معرب ہونے کا ذکر ہے۔

(۲) سداب، فرہنگ میں نہیں لیکن حاشیے میں ہے کہ : " سداب کوئی عربی لفظ نہ نکلا، میں گمان کرتا ہوں کہ سراب ہے"۔ جناب عرشی نے غالب کا یہ قول تو نقل کیا ہے کہ سداب عربی الاصل ہے، لیکن غالب کا یہ بیان کہ سراب کتب طب میں ہے اور عرفی کے یہاں ہے قلم انداز کر دیا ہے۔ سداب غالبًا عربی الاصل نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ کوئی لفظ ہی نہیں، سراب کا مصحف ہے۔ سداب طب کی ان تمام فرہنگوں میں جو مفردات سے بحث کرتی ہیں، اور جن کی طرف اس وقت میں نے رجوع کیا ہے، موجود ہے۔ شعرائے فارسی میں نہ صرف عرفی بلکہ خاقانی، سیف الدین اسفرنگی وغیرہ کے کلام میں ملتا ہے:

سی سال زنفس معصیت زاد اکنوں دہدش سداب توبہ (عرفی) [قصائد عرفی ص ۹۱ طبع نولکشور]

افسردہ تر ز برف دلِ چوں سداب شاں (خاقانی)

ہم چوں سداب نسل خود از خود بریدہ ایم (سیف)

سداب تو نہیں، مگر سذاب عربی فرہنگوں میں بھی ہے۔ قاموس میں ہے : " السذاب وہو بقل معروف" صاحب قاموس کے عہد میں بلکہ اس کے سیکڑوں سال قبل سے ایران میں خاص خاص علاقوں سے قطع نظر سداب ذال معجمہ ہی سے لکھا جاتا ہے۔ فارسی الفاظ میں کہاں دال مہملہ اور کہاں ذال معجمہ ہونی چاہیے، اس کے بارے میں ابن یمین نے دو قطعے لکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

گرت میل باشد کہ دریا رسی ہمی دال را باز دانی ز دال
بگویم یکے ضابطہ یادگیر کہ ایں را نیابی بہ گیتی ہمال
اگر پیشِ او حرفِ علت بود بجز ذال معجم ندارد مجال
وراں حرف جز حرف علت بود نگہ کن کہ آں حرف را ہست حال

اگر ہست ساکن تو اش دال داں ۔۔۔ دگر نہ ہماں ذال معجم نہ دال ہے

(۳) فرہنگ میں نیتر کی یا مکسور ہے، اور یہ صحیح ہے کہ مگر ہندوستان میں کچھ لوگ فتحۂ یا سے بھی بولتے اور لکھتے ہیں۔ حرکت یا کے بارے میں غالب کا کوئی بیان موجود نہیں لیکن، قریب بہ یقین ہے کہ وہ یا کو مفتوح سمجھتے تھے۔ ان کے کلیات نظم فارسی میں نیتر، دیگر، گوہر، لشکر، ساغر وغیرہ کا قافیہ آیا ہے اور ایک جگہ بھی اس طرح منظوم نہیں ہوا کہ کسرۂ یا پر مشعر ہو سکے۔

نگہ خشم گینش از تیزی ۔۔۔ نور از روے نیتر اندازد
نامہ بنازد بہ خویش کز اثر فیض مدح ۔۔۔ نقطہ زبس روشنی تابش نیتر گرفت
آفتابی وشیر مرکب تست ۔۔۔ آسمانی وجبہہ نیتر تو
صد آفتاب تواں ساختن بہ بازیچہ ۔۔۔ ز ذرہ کہ بود در ضیاے نیتر من

اس خیال کو کہ غالب کے نزدیک نیتر کی یا مفتوح تھی، اس امر سے تقویت ہوتی ہے کہ کلیات (اشاعت دہلی) کے سرورق پر اس کتاب کے مصحح اور غالب کے تلمیذ خاں ضیاء الدین احمد کا تخلص نیّر بہ فتحۂ یا مرقوم ہے، اور انھوں نے اسے انور، و اصغر کا قافیہ بھی باندھا ہے:

از کوریِ خود بروز انور عقرب ۔۔۔ نیشے زدہ بپای نیّر عقرب
برمہ رسد از تو چشم زخمے نہ بہر ۔۔۔ من نیّر اعظم نہ اصغر عقرب

نیّر کافر اور مجاور کی طرح نہیں کہ فارسی میں حرف ماقبل را مفتوح بھی مستعمل ہو۔

(۴) جناب عرشی نے دریچہ (بہ فتحۂ یا) کو جو غالب کے نزدیک اصل لغت دریچہ (بہ سکون یا) میں تصرف سے پیدا ہوا ہے، اصل لغت قرار دیا ہے اور دریچہ (بہ سکون یا) کو اس کے ذیل میں درج کیا ہے۔ اس لغت کی بحث میں غالب نے دریچّہ (بہ تشدید چ) کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ دراصل دریچہ (بہ فتحۂ یا) کوئی لفظ ہی نہیں۔ طغرا کے شعر:

روز و شب در یچۂ مشرق و مغرب باز است ۔۔۔ ورنہ از تنگی این خانہ قفس می گیرد

میں دریچہ (یا کے ساتھ) نہیں دربچہ (درب + چہ) ہے' اور کلیات ظغرا کے ایک صحیح نسخے میں جو موم میں ہے' چ سے قبل کے حرف کے نیچے صاف ایک نقطہ ہے۔
کسی ایرانی تورانی یا ہندوستانی شاعر نے یا ے معروف کے سکون کو فتحے سے نہیں بدلا۔ درب فارسی نہیں عربی ہے' مگر برابر فارسی میں مستعمل رہا ہے۔ ابونصر فراہی کا مصرع ہے:

سکّہ کوچہ' درب دروازہ است' معبرہ گزر (نصاب ص۵)

رموز حمزہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے اور عہدِ حاضر کے ایک ناول ہما میں بھی ہے''۔

۵۔ جناب عرشی نے حواشی میں غالب کے بعض اغلاط کا ذکر کیا ہے' لیکن' ان کے مقابلے میں ان اغلاط کی تعداد جن سے انھوں نے تعرض نہیں کیا کہیں زیادہ ہیں۔ اس سے یہ قباحت بھی پیدا ہوئی کہ جہاں انھوں نے اختلاف کا اظہار نہیں کیا' لوگ اسے اتفاق تصوّر کریں گے' گوفی الحقیقت ایسا نہ ہو۔ مثلاً بہ قصر دولتم الخ کا نظامی کی طرف انتساب' اروند کی نسبت غالب کا بیان' اکراکا کے بارے میں مناقب العارفین کا غلط حوالہ۔

۶۔ حواشی میں بہت سی باتیں ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش ہے' یا جن میں اضافے کی ضرورت ہے۔ چند باتیں بہ طور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

آغشتن کے غنین کے مفہوم کی سند میں فردوسی کا یہ شعر دیا ہے:

نہ ایرانیاں منا بلسے کشتہ ام زمیں را بہ خون و گل آغشتہ ام

اس شعر میں ت ۔ روی ہے جو حرف وصل ہ سے مل کر متحرک ہو گئی ہے' اس صورت میں ک اور غین کی حرکت داخل قافیہ نہیں۔ حاشیہ ص۳۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عرشی پذیرہ [کی] ہا ی مختفی کو کاتب کی غلطی سمجھتے ہیں' لیکن خود غالب کے ہاتھ کی تحریروں میں پذیرہ ہای مختفی سے موجود ہے اور فردوسی کے یہاں خیرہ کا قافیہ آیا ہے۔

اس تبصرے کا خاتمہ ان سطور پر ہوتا ہے:

''فرہنگ غالب ان نقائص کے باوجود جن کا ذکر اس تبصرے میں ہے ادبیات غالب میں مفید اضافہ ہے۔ جناب عرشی نے اس کی ترتیب میں بڑی عجلت سے کام لیا ہے' کچھ وقت اور اس پر صرف ہوتا' تو مفید تر ہو سکتی تھی''۔

عرشی صاحب کو ان کی ساری محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی داد قاضی صاحب نے صرف دو لفظوں ''مفید اضافہ'' میں دینا کافی سمجھا۔

(۵) مآثرِ غالب

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن (۱۸۸۱ء - ۱۹۴۷ء) ایک ممتاز مصنف اور اُردو کے اچھے انشا پرداز تھے بنگال ہی نہیں پورے ہندستان میں اپنے علمی ذوق و شوق کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ اِن کی تصانیف میں "مساجد ڈھاکہ"، "شعراے ڈھاکہ"، "آسودگانِ ڈھاکہ"، "ڈھاکا اب سے پچاس برس پہلے"۔ ایسی کتابیں ہیں کہ بنگال اور خاص طور پر ڈھاکا کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اِن کی سب سے اہم تصنیف "ثلاثہ غسالہ" ہے جو بنگال کے عربی، فارسی اور اُردو مصنفین، شعرا، ادبا، اطبا اور دوسرے مشاہیر کے حالات اور اُن کی تصانیف پر مشتمل ہے، اور جس میں ان کے بارے میں اہم معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تصنیف پر جو بنگال کے مصنفین کی تصانیف و تحریرات کے لیے بہت قیمتی ذریعہ اطلاع ہے، حکیم صاحب مرحوم نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے رسالۂ معیار کے پہلے شمارے (مارچ ۱۹۳۶ء) میں "عالمِ ادب" کے عنوان کے تحت اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "ثلاثہ غسالہ: اس نام کی ایک کتاب کشف الظنون کی طرز پر حکیم حبیب الرحمٰن صاحب لکھ رہے ہیں، اور اب قریب تکمیل ہے۔ قرینہ ہے کہ انجمنِ ترقیِ اُردو کی طرف سے اس سال یا سالِ آئندہ شائع ہو جائے۔ اس کتاب کو حکیم صاحب کی ادبی زندگی کا حاصل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ اس کی تکمیل میں ان کی زندگی کے بیس پچیس سال صرف ہوئے ہیں۔ ...
> اس کتاب میں ان تمام کتابوں کا ذکر ہوگا جو تینوں زبانوں میں بنگالی مصنفین نے لکھی ہیں۔ بیرونی اشخاص نے جو بھی کتابیں زمانۂ قیامِ بنگالہ میں لکھی ہیں، وہ اس میں شامل ہیں۔"

حکیم حبیب الرحمٰن (مرحوم) اپنی زندگی کے آخری زمانے تک اس کی ترتیب و تہذیب اور حذف و اضافے میں مصروف رہے۔ وہ مسودے کو مبیضے کی شکل دینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں وفات پا گئے۔ اس کے تعارف میں ڈھاکا یونی ورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر محمد عبداللہ،

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر اور ڈاکٹر ام سلمٰی کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے اس پر ایک مفصل مضمون رسالہ معارف میں لکھا تھا۔ انھی نے اپنے مقدمہ و حواشی کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے۔ اسے پروفیسر وحید قریشی اپنے ادارہ "بزم اقبال" کی طرف سے جلد ہی شائع کرنے والے ہیں۔

حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کے پاس مطبوعات و مخطوطات کا بہت اچھا اور قیمتی ذخیرہ تھا۔ ان کی اہم کتابوں میں ایک قلمی مجموعۂ خطوط بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بقول حکیم صاحب شائق جہانگیر نگری کا مرتب کردہ ہے جو غالبیات کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں علی اکبر خاں کے نام غالب کا ایک فارسی خط، خاتمۂ گل رعنا کی نامکمل عبارت، مثنوی بادِ مخالف کی اوّلین روایت اور غالب کے ۳۲ فارسی خطوط مرزا احمد بیگ تپاں، خواجہ محمد حسن، خواجہ فخر اللہ اور ایک نامعلوم الاسم مکتوب الیہ کے نام ہیں۔ ۸ خطوں کے سوا سارے خطوط غالب نے کلکتے میں لکھے ہیں، اس طرح ان خطوط کا زمانۂ تحریر بہت حد تک متعین ہو جاتا ہے۔

اسی مجموعے میں مرتب یعنی شائق جہانگیر نگری کے فارسی خطوط بھی ہیں جن میں غالب کی فارسی نثر کے تتبع کی کوشش کی گئی ہے۔

قاضی عبدالودود کو غالباً حکیم صاحب کے ذریعہ غالب کے ان غیر مطبوعہ خطوط کا علم ۱۹۴۳ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ وہ ایک خط میں جو ۲۵؍ اگست ۱۹۴۳ء کا تحریر کردہ ہے، شیخ محمد اکرام کو لکھتے ہیں:

> " فارسی کے ۳۳ غیر مطبوعہ خطوط ابھی حال میں ملے ہیں۔ میرے ایک دوست انھیں مرتب کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں چھپوا دوں گا۔"

یہ دوست ڈاکٹر عندلیب شادانی صدر شعبۂ فارسی و اُردو ڈھاکا یونی ورسٹی تھے۔

انھی خطوط کے بارے میں قاضی صاحب، شیخ صاحب کو یکم اکتوبر کو تحریر کرتے ہیں:

> " غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط ڈھاکا میں ہیں اور مجھے ان کے دیکھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا۔ مکتوب الیہ احمد بیگ خاں تپاں

اور مرزا ابوالقاسم ہیں جن کا ذکر آپ کی کتاب میں ہے۔ یہ خطوط یا تو زمانۂ قیام کلکتہ میں لکھے گئے یا کلکتے سے واپسی کے کچھ بعد۔ خطوط ڈھاکا سے آجائیں تو کوئی صورت اس کی نکالی جائے گی کہ طباعت سے پیشتر آپ انھیں دیکھ سکیں۔ خطوط کب تک آئیں گے، اس کی نسبت فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا، اتنا علم ہے کہ ترتیب کا کام جاری ہے۔"

اواخر نومبر ۱۹۴۴ء تک یہ خطوط قاضی صاحب کی نظر سے نہیں گزرے تھے۔ ڈاکٹر شادانی انھیں ۲۹ر نومبر کو لکھتے ہیں:

"آپ فرمائیں تو غالب کے خطوط ..... روانہ کردوں تاکہ آپ انھیں دیکھ لیں۔"

ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کے نام قاضی صاحب کے کچھ خطوط مجھے مشفق خواجہ صاحب کی مہربانی سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالب کے ان خطوط کی ترتیب کے لیے پورے طور پر آمادہ تھے، انھوں نے کام شروع بھی کر دیا تھا۔ وہ ۲۰ر جون ۱۹۴۴ء کو قاضی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سرسید احمد خاں نے جب آئینِ اکبری کو اڈٹ کیا تو غالب نے فارسی نظم میں اس کا خاتمہ لکھا۔ اس میں آئینِ اکبری کی تنقیص کی ہے اس لیے سرسید نے یہ نظم آئینِ اکبری کے ساتھ شامل نہیں کی، غالب کے کلیات میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

طرزِ تحریرش اگر گوئی خوش است
نے فزوں از ہر چہ می جوئی خوش است

— دوسرے مصرعے کا مطلب آپ کیا سمجھتے ہیں؟ میں تو یہ سمجھا ہوں کہ طرزِ تحریرش ہر چہ می جوئی ازاں (فزوں خوش یعنی) خوش تر نیست یعنی اگر تم یہ کہو کہ اس کا طرزِ تحریر اچھا ہے تو کچھ ایسا زیادہ اچھا بھی نہیں ہے۔ غالب کے ان الفاظ کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔
"ان شاءاللہ میں یہ ثابت کروں گا کہ غالب کے فارسی خطوط جہاں

تک طرز عبارت کا تعلق ہے سراسر اسی "مردود" آئینِ اکبری کا چربہ ہے۔
فقرہ فقرہ بلکہ لفظ لفظ آئینِ اکبری سے ماخوذ ہے"۔
ڈاکٹر شادانی ۱۹۴۷ء کے اوائل تک مقدمے میں اُلجھے رہے، ۶ جنوری ۱۹۴۷ء کو لکھتے ہیں :

"یونی ورسٹی مدتوں بند رہی، ۲ جنوری کو کھلی ہے، اس لیے آج کل کام زیادہ ہے خصوصاً اس ہفتے میں۔ اس کے فارغ ہوتے ہی خطوطِ غالب کو لوں گا۔ ابھی آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا مقدمہ لکھنے کے لیے میں نے کتنی زحمت کی ہے۔ دوسری کتابوں کے علاوہ مکتوباتِ بیدل اور تینوں جلدیں آئینِ اکبری کی پڑھیں۔ اور ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھا۔ پنج آہنگ کا بھی اسی طرح مطالعہ کیا۔ پھر اپنے مطلب کا مواد فراہم کیا۔ خیر اس کا اندازہ آپ کو مقدمہ دیکھنے کے بعد ہوگا۔ مواد فراہم ہو چکا ہے، لکھنا باقی ہے۔ انشاء اللہ ایک ہفتے کے بعد لکھنا شروع کردوں گا اور جب تک اس کو ختم نہ کرلوں گا کسی دوسرے کام کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ فروری کے ختم تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ آئندہ جو خدا کو منظور ہو۔"

وہ کام مکمل نہ کر سکے، شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ خطوط کی تیار کردہ نقل کا حکیم صاحب کے مجموعے سے مقابلہ کر کے متن کی تصحیح کرتے، خطوط پر حواشی لکھتے اور ایک مختصر سا مقدمہ لکھ کر کتاب کو مرتب کر دیتے، وہ بہت تفصیل سے مقدمہ لکھنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ان کی مصروفیات اور کچھ ناسازیٔ طبع اس کام کی تکمیل میں مانع رہیں۔

اس عرصے میں قاضی صاحب نے ان خطوط کی نقل لے لی۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک ملاقات میں مجھے یہ نقل شدہ خطوط دکھائے اور شادانی صاحب کی آہستہ روی کا ذکر کیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ غالب اور اس کے عہد پر آپ کا مطالعہ ان سے گہرا ہے اور آپ ان خطوط کی ترتیب کا کام زیادہ بہتر طور پر اور جلد انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے اسے علی گڑھ

میگزین کے غالب نمبر میں شائع کرنے کی پیش کش بھی کی۔ قاضی صاحب نے کچھ دن اور انتظار کیا۔ اب وہ شادانی صاحب سے خاصے مایوس ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ خود انھیں مرتب کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا خط آیا کہ غالب کے ان غیر مطبوعہ خطوط کے ساتھ ان کی دوسری کم یاب تحریرات نثر و نظم بھی جو یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں، اور کسی مجموعے میں نہیں آئی ہیں، مرتب کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے مسرت کا اظہار کیا۔ اور انھیں بھی شائع کر دینے پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ انھوں نے غالب کے دیباچے، تقریظیں، اشعار وغیرہ پہلے بھیجے۔ پھر حواشی۔ ان کے بعد غیر مطبوعہ فارسی خطوط، پھر متعدد قسطوں میں ان پر حواشی اور سب سے آخر میں "عرضِ حال" جس پر ۳۰؍مارچ ۱۹۴۹ء کی تاریخ درج تھی۔ میں نے یہ پورا مجموعہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۸ء-۱۹۴۹ء) کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا۔ انھوں نے نام آثارِ غالب رکھا تھا اور سرورق پر چھپ بھی گیا تھا۔ لیکن میری اس اطلاع پر کہ اس نام سے شیخ محمد اکرام کی کتاب شائع ہو گئی ہے[1]، نام مآثرِ غالب تجویز ہوا۔ غالب نمبر میں تو اس مجموعے پر یہی نام رہا لیکن ان کی فرمایش پر سو دو سو نسخے جو میں نے ان کے لیے فاضل چھپوائے تھے ان پر دوسرا سرورق مآثرِ غالب کے نام سے طبع کرایا اور قاضی صاحب کی ہدایت کے بموجب پیشانی پر "سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار" چھپوایا۔ یہ کتاب ستمبر ۱۹۴۹ء

---

[1] "آثارِ غالب" شیخ محمد اکرام کی کتاب کے دوسرے اڈیشن کے اس حصے کا نام ہے جس میں انتخابِ اشعارِ اردو و فارسی ہے۔ نوادرِ غالب نام بُرا نہیں۔"

(مکتوب مختار الدین احمد بنام قاضی عبدالودود مورخہ ۱۳؍فروری ۱۹۴۹ء)۔

گویا کتاب کے نام "مآثرِ غالب" کی تعیین اس تاریخ کے بعد ہوئی۔ نام "نوادرِ غالب" جو یہ تجویز میں نے واپس لی اور احوالِ غالب، نقدِ غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب کا نام رکھ دیا جس کے مسودے کا بیشتر حصہ میرے یورپ چلے جانے کے بعد انجمن کے دفتر یا مکتبۂ جامعہ سے ضائع ہو گیا۔ قاضی صاحب کے نام میرا یہ خط ان کی وفات کے بعد ان کے ذخیرۂ خطوط سے برآمد ہوا۔

میں شائع ہوئی۔ نئے سرورق کے چوتھے صفحے پر "التماس" کے عنوان سے قاضی صاحب کی ایک مختصر تحریر بھی چھپی ہے جس میں بعض امور کی تفصیلات و توضیحات ہیں۔

غالب کی تحریرات کا یہ نادر مجموعہ آج سے کوئی ۴۵ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے نسخے اب بے حد کمیاب ہیں، پھر اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔ اس لیے اس کے ضروری کوائف درج کیے جاتے ہیں:

مآثرِ غالب ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سورق کی پیشانی پر نظیری کا یہ شعر درج ہے۔

زندہ دارد مرد را آثار مرد
بوے گل باقیست چوں گردد گلاب

کتاب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام معنون کی گئی ہے۔ قاضی صاحب ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں ڈاکٹر صدیقی کو لکھتے ہیں:

"مآثرِ غالب ایک بہت ہی حقیر تحفہ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس کی ترتیب و تصحیح کما حقہٗ نہیں ہو سکی اور اس کا آخری حصّہ تو ایسا بُرا چھپا ہے کہ دیکھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کا لطف و کرم ان باتوں کو نظر انداز نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

کتاب میں فہرست مضامین کے بعد ایک صفحے کا "عرضِ حال" قاضی صاحب کے قلم سے ہے جس پر تاریخ تحریر ۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء درج ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"آثارِ غالب کا بڑا حصّہ یا تو قلمی کتابوں سے لیا گیا ہے یا ایسے مطبوعات سے جو عام دست رس سے باہر ہیں۔۔۔ ... فارسی خطوط حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کے کتب خانے کے ایک قلمی مجموعے سے ماخوذ ہیں حکیم صاحب اُردو کے اچھے انشا پرداز اور زبردست عالم تھے۔ علمی خدمات بھی انھوں نے کم نہ کی تھیں۔ اس کا اندازہ ان کے کارنامۂ حیات ثلاثۂ غسالہ کی اشاعت سے ہوگا۔ آثارِ غالب کی ترتیب یا اس کے حواشی کی تحریر میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی، جناب عرشیؔ جناب

مہیش پرشاد، جناب سید وزیر الحسن عابدی اور جناب مختار الدین احمد آرزو
سے مدد ملی ہے۔ میں ان اصحاب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ چھاپے کی
نگرانی بھی آرزو صاحب کے سپرد ہے۔ اگر وہ اسے صحیح چھپوا سکے تو دُہرے
شکریے کے مستحق ہوں گے۔
آثارِ غالب کی ترتیب بڑی عجلت میں ہوئی ہے۔ بعض امور کی حسب
دلخواہ تحقیق قلت وقت کی وجہ سے نہ ہو سکی۔ میں ناظرین سے معذرت
خواہ ہوں۔"

مآخذ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل میں اُردو فارسی کی وہ نظم و نثر ہے جو مختلف ماخذوں سے
حاصل کی گئی ہے۔ اس کے مندرجات یہ ہیں:

"اردو نثر" کے عنوان کے تحت دیباچۂ لطائفِ غیبی، دیباچۂ تیغِ تیز، ایک استفتاء
جو تیغِ تیز کے آخر میں ہے، مکتوباتِ اردو بنام میر ولایت علی مہتمم مسیح عظیم (مطابع عظیم آباد
مکتوبہ ۱۸۶۵ء (اس کا لفافہ کتب خانۂ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ اصل خط کا اب تک پتا
نہیں چل سکا)۔ دو فارسی شعروں کے مطالب (جو کلیاتِ فارسی مکتوبہ ۱۲۵۴ھ مخزونہ کتب خانۂ
خدا بخش کے حاشیے پر غالب کے قلم سے لکھے ہوئے ملتے ہیں) اُردو نظم کے تحت اشتہار پنج
آہنگ (منظوم) جو غلام نجف خاں کے نام اسعد الاخبار آگرہ میں چھپا تھا اور قریب بہ یقین ہے
کہ غالب کا لکھا ہوا ہے، غزل اُردو:

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

ماخوذ از دیوانِ الٰہی بخش خاں معروف، (متوفی ۱۲۴۳ھ)، ہجوِ سعادت علی ماخوذ از لطائفِ
غیبی، فردیات:

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

مروجہ دیوان میں اس قافیہ و ردیف میں ایک غزل ہے مگر یہ شعر نہیں۔ دیوانِ غالب کے ایک

قلمی نسخہ ملوکۂ راقم اور دیوانِ اُردو اشاعتِ ثانی میں یہ شعر ملتا ہے جسے غالب نے ظاہراً پست سمجھ کر تیسری اشاعت سے خارج کر دیا تھا۔ ماخوذ از تذکرۂ سراپا سخن مؤلفہ محسن لکھنوی۔

فردیات میں دوسرا حسبِ ذیل شعر درج ہوا ہے۔

کوئی اس کا جواب دو صاحب
سائلوں کا ثواب لو صاحب

غالب کا یہ شعر لطائفِ غیبی سے نقل کیا گیا ہے۔

فارسی نثر کے تحت تقریظِ قاطعِ برہان (۱۲۷۰)، تقریظِ سفرنگِ دساتیر مصنفۂ محمد نجف علی خاں مجہری (متوفی ۱۲۹۸ھ) اور فارسی نظم کے تحت نامۂ منظوم بنام جواہر سنگھ جوہر (ماخوذ از کلیاتِ غالب فارسی مکتوبہ ۱۲۵۴ھ مخزونہ کتب خانۂ خدا بخش، تین معمے جو کلیات مخزونۂ کتب خانہ خدا بخش کے دونوں نسخوں میں ملتے ہیں، ایک رباعی: "نام اب و جدّ و عم نہ گیرند ایں قوم" کسی کی ہجو میں ہے، سبدِ چیں اشاعتِ اوّل سے ماخوذ، چوتھا مصرعہ فحش ہے اس لیے مالک رام صاحب کی مرتب کردہ اشاعت سے خارج ہے۔ فردیات میں دو شعر درج ہیں۔ پہلا شعر لطائفِ غیبی کے سرِ ورق سے لیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ غالب کا ہوگا۔ دوسرا شعر تذکرۂ مشاہیر کاکوری مصنفہ حافظ محمد علی حیدر (طبع ۱۹۲۷ء) سے ماخوذ ہے۔ غالب کی پنج آہنگ کے جواب میں امیر حسن خاں سہل (متوفی ۱۲۶۳ھ) نے پنج گلشن تصنیف کی تھی۔ قاضی صاحب نے حواشی میں لکھا ہے کہ عجب نہیں کہ مصنف تذکرۂ مشاہیرِ کاکوری کا ماخذ یہی کتاب ہو۔ یہ کتاب جس کا سالِ تالیف ۱۲۶۰ھ ہے، مدتوں سے مفقود ہے۔

مآثرِ غالب حصہ دوم میں وہ فارسی کے خطوط ہیں جو کتب خانۂ حکیم حبیب الرحمٰن کے ایک مجموعے سے (جو ظاہراً شائق جہانگیر نگری کا مرتب کردہ ہے) لیے گئے ہیں۔ یہ تعداد میں ۲۲ ہیں ۲۳ نہیں جیسا کہ قاضی صاحب نے شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں سہواً لکھا ہے۔ غالب کے یہ خطوط مرزا احمد بیگ تپاں دہلوی (متوفی مارچ ۱۸۳۲ء) فیض الدین حیدر عرف حیدر جان شائق جہانگیر نگری (وفات بعد از ۱۲۷۰ھ)، خواجہ محمد حسن، خواجہ فخر اللہ اور ایک نامعلوم الاسم مکتوب الیہ کے نام ہیں۔ قاضی صاحب نے شیخ محمد اکرام کے نام ایک

خط میں جو یہ لکھا ہے کہ "ان خطوط کے مکتوب الیہم، احمد بیگ خاں تپاں اور مرزا ابوالقاسم ہیں جن کا ذکر آپ کی کتاب میں ہے۔" تو اس وقت تک انھیں ان خطوط کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ان کی اطلاع کے ماٰخذ حکیم حبیب الرحمٰن اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے خطوط تھے۔ ابوالقاسم خاں کے نام مرزا کا کوئی خط نہیں، ایک خط میں صرف ان کا نام آیا ہے۔ ہاں ان کے نام مرزا کے اکیس خطوط متفرقاتِ غالب (رام پور، ۱۹۴۷ء) مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب میں ضرور موجود ہیں۔

شائق کے مرتّب کردہ اس مجموعے میں کچھ تحریرات اور بھی تھیں جنھیں قاضی صاحب نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، وہ یہ ہیں: علی اکبر خاں کے نام غالب کا ایک فارسی خط (یہ پنج آہنگ میں موجود ہے) اور مثنوی بادِ مخالف کی اوّلین روایت۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قاضی صاحب نے اس کا مکمل متن پروفیسر آصف علی اصغر فیضی کے مرتب کردہ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن میسلینی جلد اول میں شائع کر دیا تھا۔ مآثرِ غالب میں ان کی تین تحریراتِ نثر و نظم کے عدمِ شمول کی وجہ ظاہر ہے۔

مآثرِ غالب میں غالب کی تحریراتِ نظم و نثر تیس صفحات میں آئی ہے۔ ان پر قاضی صاحب نے نہایت مفید اور بہت قیمتی حواشی تحریر کیے ہیں۔ غالب کی تحریراتِ نظم و نثر کے ہر حصے کے متعلق ایسے بیش قیمت معلومات انھوں نے پیش کیے ہیں کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان پر اضافہ مشکل نظر آتا ہے۔

مآثرِ غالب حصہ اول کے حواشی میں لطائفِ غیبی، سیاح، تیغِ تیز، آغا احمد علی، مرزا رحیم بیگ مصنف قاطعِ برہان، امین الدین امین دہلوی مصنف قاطعِ القاطع، میر ولایت علی عظیم آبادی، غلام نجف خاں، الٰہی بخش معروف، میر سعادت علی، قاطع برہان، سفر نگ دساتیر مصنفۂ محمد نجف علی خاں، جواہر سنگھ جوہر، رائے چھجمل، امیر حسن خاں بسمل، اور دوسرے اصحاب پر بہت اچھے معلومات پیش کیے ہیں۔

حصۂ دوم، یعنی غالب کے فارسی خطوط کے حواشی چار فصلوں پر منقسم ہیں پہلی فصل میں مکتوب الیہم مرزا احمد بیگ تپاں، فیض الدین حیدر شائق، اور خواجہ محمد حسن کے حالات جو

ممکن الحصول مصادر سے حاصل ہو سکے ہیں۔ لکھے گئے ہیں۔

دوسری فصل میں قاضی صاحب نے غالب کے خطوط میں جن اصحاب کا ذکر آیا ہے ان میں انھوں نے سراج الدین احمد، مرزا ابوالقاسم دہلوی، مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ، نواب علی اکبر خاں یکتا، محمد علی بن مرزا احمد بیگ تپاں دہلوی، نواب حسام الدین حیدر خاں، نامی اور محمد محسن کا تعارف کرایا ہے۔ جن اصحاب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اس کی انھوں نے صراحت کر دی ہے۔ مثلاً خواجہ مستقیم، نواب مہدی علی خاں بہادر[ل]، راؤ شیو راؤ کے متعلق انھوں نے لکھ دیا کہ یہ پتا نہ چل سکا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ سید عالم علی خاں کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ مجلت میں ٹھیک پتا نہ چل سکا کہ کون ہیں۔ ظاہراً میر عالم بہادر (ممدوح مرزا علی لطف) کے اخلاف سے تھے۔ اسی طرح رحم علی خاں اور جانو کے بارے میں انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ ظاہراً یہ دونوں تپاں کے ملازم تھے۔

تیسری فصل میں قاضی صاحب نے غالب کے ان مکتوب الیہم کا پتا چلانے کی کوشش کی ہے کہ جن کے ناموں کی خطوط میں صراحت نہیں ملتی۔ ساتھ ہی ساتھ ان خطوط کا زمانۂ تحریر متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ خط کا مکتوب الیہ اور زمانۂ تحریر نہ ہونے یا غیر یقینی ہونے کی شکل میں انھوں نے علامتِ استفہام لگا دی ہے جیسے :-

خط ۶ : تپاں ؟ زمانہ ؟

خط ۸ : تپاں ؟ زمانہ ؟

خط ۸ : تپاں ؟ زمانہ ؟

یعنی نہ مکتوب الیہ کا نام معلوم ہو سکا اور نہ تاریخ تحریر، لیکن میرا قیاس ہے کہ یہ خطوط تپاں کے نام ہیں۔

ل بعد کو جب مآثرِ غالب کا سرورق چھپنے گیا تو انھوں نے "التماس" میں شامل کرنے کے لیے حسبِ ذیل عبارت لکھ کر بھیجی: مہدی علی خاں، صاحب سیر المتاخرین کے ایک پوتے کا نام تھا، عجب نہیں غالب کے خط میں انھیں کا ذکر ہو۔ (سرورق صـ)۔

کچھ دوسرے مندرجات اس قسم کے ہیں :

- خط ۵ اس زمانے کا ہے جب غالب کلکتے میں تازہ وارد تھے۔
- خط ۱۱ تپاں ؛ ورودِ کلکتہ کے چند ماہ بعد کا ہے جب غالب کو ہدایت کی جا چکی تھی کہ وہ اپنا مقدمہ دہلی میں پیش کریں۔ رزیڈنٹ دہلی کے حالات اسی غرض سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔
- خط ۱۰ خواجہ محمد حسن۔ خط ۱۴ اور خط ۱۵ کا زمانۂ تحریر ایک معلوم ہوتا ہے۔
- خط ۱۷ تپاں ؛ یہ خط ظاہراً اس زمانے کا ہے جب غالب کلکتے میں پابہ رکاب ہیں۔
- خط ۱۲، ۱۴ خواجہ محمد حسن ؛ میری رائے میں دونوں خط ۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں۔
- خط ۲۱ تپاں ؛ اپنے ملازمین کی کلکتہ و اہلِ کلکتہ سے ناواقفیت کا ذکر کیا ہے۔ ظاہراً اس زمانے کا ہے جب کلکتے میں وہ تازہ وارد تھے۔
- خط ۲۲ تپاں ؛ غالباً مرزا افضل بیگ کی وفات کے بعد لکھا گیا ہے۔
- خط ۲۴ تپاں یہ خط ادبی نزاع کے آغاز کے بعد کا ہے۔[1] شوال ۱۲۴۲ھ یا اس کے کچھ بعد لکھا گیا ہوگا۔
- خط ۲۷ تپاں ؛ تاریخ تحریر ۴ دسمبر ۱۸۳۰ء یا ۱۸۲۱ء ہوگی۔ موخرالذکر زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

متفرقاتِ غالب مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب ص ۶۴، خط ۲۰ بنام تپاں سے قاضی صاحب نے مآثرِ غالب خط ۲۷ کی تاریخ تحریر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح ۳۲ خطوط پر مختصر حواشی ان خطوط کے مکتوب الیہوں اور زمانۂ تحریر پر انھوں نے سپردِ قلم کیے ہیں۔ لیکن مختصر الفاظ اور اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں، جس کی اردو دنیا عام طور پر عادی نہیں۔

چوتھی فصل میں خطوط کے متعلق بعض توجہ طلب امور سلسلہ وار درج کیے گئے

ہیں۔ یہاں بعض کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ یہ کس توجہ اور محنت سے لکھے گئے ہیں:

۱۔ حکیم صاحب، ممکن ہے کہ حکیم سیّد احمد علی خاں ہوں۔ 'استشعار' کے معنی 'استغنا' نہیں' کاتب یا غالب کی غلطی ہے۔ "سرقدم" کے بعد ساختن کاتب سے چھوٹ گیا ہے سہولیت کی جگہ سہولت ہونا چاہیے۔ مکتوب الیہ سے قرض مانگا ہے' مدعا یہ ہے کہ رقم مطلوبہ یک مشت مل جائے۔

۲۔ دعوتِ شادی' ہندستانی فارسی ہے' گویہ ممکن ہے کہ ان ایرانیوں نے بھی جو ہند آئے ہیں لفظ "شادی" کو اس طرح استعمال کیا ہو۔ مہدی باغ ... پہلے اس محلّے کو کہتے تھے جو رپن اسٹریٹ اور الیٹ روڈ کے درمیان واقع ہے۔ اس محلّے میں پہلے سر برآوردہ مسلمان شرفا رہتے تھے۔ اس کے قریب اب تک آغا مہدی اسٹریٹ موجود ہے۔ "ن" [حکیم حبیب الرحمٰن کے کتب خانے کا مجموعۂ خطوط فارسی جس سے آثارِ غالب میں فارسی خطوط لیے گئے ہیں] میں "بیچتاب" ہے۔ غالب نے پیچ و تاب لکھا ہوگا۔

۳۔ شبِ شادیِ نورِ چشم' ہندستانی فارسی ہے۔ بےخبر برخاستم (سے غالب نے) یہ معنی لیے ہیں کہ کسی کو خبر کیے بغیر اُٹھ گیا۔ اس کے بعد کا جملہ اس سے میل نہیں کھاتا۔

۴۔ جامِ جہاں نما کلکتے کا اخبار تھا اس کے متعلق ایک مقالہ (ہندستانی الٰہ آباد) میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس خط سے ثابت ہے کہ گلِ رعنا کی ترتیب کلکتے ہی میں ہو گئی تھی۔

۱۶ اس خط سے ظاہر ہے کہ غالب حیدرآباد یا کسی اور ریاست سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سیّد عالم و قبلۂ اہل عالم سے ظاہراً نواب سیّد عالم علی خاں مراد ہیں۔ صنعت تعطیل میں جس نثر کا ذکر ہے وہی ہوگی جو معتمدالدولہ کی مدح میں لکھی گئی ہیں اور پنج آہنگ میں موجود ہے ص ۴۲۔

۱۷۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوانی میں شب کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ یہ بات نئی ہے کہ اتوار کے دن اکل لحم سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ پتا نہیں کہ یہ عارضی بات تھی یا ہمیشہ کا دستور

تھا۔ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب دو شنبے کے دن کلکتے سے رخصت ہونے والے تھے۔

۱۹۔ برجو تالاب، یہ تالاب اب تک موجود ہے۔ کلکتہ کلب اور سینٹ پال کیتھڈرل کے درمیان واقع ہے۔

۲۱۔ ایک کہار اور دو خدمت گار ظاہراً دہلی سے ساتھ گئے تھے۔ کودک کہاران کے علاوہ معلوم ہوتا ہے۔

۲۳۔ تپاں، غالباً غالب کے خطوط اپنی بیاض میں نقل کر لیا کرتے تھے۔ جس خط کو ضائع کرنے اور اپنی بیاض میں نقل کرنے کی ہدایت کی ہے وہ خط ۲۴ تو نہیں؟

۲۴۔ یہ خط مجموعۂ ڈھاکا کے تمام خطوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین نے غالب پر اپنے اعتراضات کو قلم بند بھی کر لیا تھا گو اس کا پتا نہیں چلتا کہ یہ اعتراضات کسی اخبار میں یا رسالے کے طور پر چھپے بھی تھے یا نہیں۔ جن اشعار پر اعتراض ہوئے ہیں وہ کلیات میں موجود ہیں (ص ۳۹۸؛ ص ۴۰۴) اور اسی طرح ہیں جس طرح غالب نے بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی میں وجودِ ذال سے متعلق غالب کے جس مسلک کا قاطع [برہان] سے علم ہوتا ہے وہ بہت قدیم ہے۔ ۱۲۴۳ھ میں بھی ان کا وہی عقیدہ تھا جو ۱۲۷۶ھ میں تھا۔ غالب کا یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ چوں کہ وہ اس سے واقف ہیں کہ اور لوگ پذیرفتن وغیرہ کو ذال سے لکھتے ہیں ز سے لکھنا املا کی غلطی نہیں۔ غلطی کی یا زائد ہے۔ غالب نے اُردو میں بھی لکھا ہے:

"غلطی ہائے مضامین مت پوچھ" میں فی الحال میں یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ ایرانیوں نے غلط کو یائے زائدہ کے ساتھ استعمال کیا ہے یا نہیں۔

۲۵۔ خط ۷ میں دو شنبے کے دن کلکتے سے روانگی کا ذکر کیا تھا' اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پنج شنبے کو کلکتے سے رخصت ہونے والے تھے۔

۳۰۔ شملہ بازار۔ خود غالب نے لکھا ہے کہ چیت بازار کے قریب ہے (پنج ص ۲۰)۔ غالب [از غلام رسول مہر] میں ہے کہ شملہ بازار چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو بعد

کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور ہوا۔ (ص ۱۰۸)۔
آواز [سگاں کم نہ کند رزقِ] گدارا:
سُنا ہوا مصرع ہے، مگر اس وقت یاد نہیں آتا کہ کس کا ہے۔ اس خط سے بھی ادبی نزاع پر
روشنی پڑتی ہے۔"

ساری عبارتیں قاضی صاحب کے قلم کی ہیں، میں نے کہیں کہیں اختصار کے پیشِ نظر حذف کردی ہیں۔ اور بعض مقامات پر صراحت کے لیے قلابین میں کچھ اضافہ کر دیا ہے۔

قاضی صاحب نہ مآثرِ غالب کی طباعت سے خوش تھے۔ نہ اپنی تحقیقات سے مطمئن۔ وہ برسوں بعد تک اور امور کے علاوہ متون کے بعض کلمات کے متعلق غور کرتے رہے۔ جناب نظیر صدیقی کے نام قاضی صاحب کے کچھ خطوط کے عکس جناب مشفق خواجہ کی عنایت سے حاصل ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب اس زمانے میں ڈھاکا میں مقیم تھے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی سے بہت قریب۔ قاضی صاحب انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غالب کے خطوط فارسی کا ایک مجموعہ ڈاکٹر شادانی کے پاس ہے، یہ خطوط آثارِ غالب (مآثرِ غالب) میں شامل ہیں جو غالب نمبر علی گڑھ میگزین کا ایک جزو ہے۔ غالب نمبر بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے۔ آپ براہِ کرم اسے دیکھ کر سوالات ذیل کا جواب دیں۔

۱۔ ص ۱۵ سطر ۵ غالب نمبر "ز بیت افتادہ" یہ کیا ہے؟
۲۔ ص ۱۵ سطر ۵ روز کلبہ، یا روز بہ کلبہ؟
۳۔ ص ۱۶ سطر ۹ گردیدہ بادا، یا گردیدہ باد؟
۴۔ ص ۱۷ سطر ۹ برشعشا؟
۵۔ ص ۲۰ خط ۲۱ کے حاشیے پر حکیم حبیب الرحمٰن کے ہاتھ کی جو عبارت ہو نقل کی جائے۔
۶۔ میں نے ۳۲ خط دیے ہیں، یہ بتلایئے کہ میں نے جو ہند سے آغاز

خطوط میں دیے ہیں وہی ہیں۔ جو ڈھاکہ کے مجموعے میں ہیں یا مختلف ہیں جواب اس طرح دیجیے کہ سمجھ میں بہ آسانی آجائے۔

یہ معاملہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر شادانی کی اعانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ کاہلی سے کام لیں یا آپ کو وقت نہ ہو تو مجھے اس کی اطلاع دیجیے کہ میں انتظار کروں۔ جہاں تک جلد ہو، لکھیے۔ یہ مزید احسان مندی کا باعث ہوگا۔" (مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء)۔

انھی کو ۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء کو تحریر فرماتے ہیں:

" غالب کے خطوط کا جو مجموعہ ڈاکٹر شادانی کے پاس ہے اس کے متعلق ایک اور [بات] دریافت طلب ہے خط ۲۴ کے آخر میں ذال کی بحث ہے۔ اس میں یہ عبارت ہے: غلطی املا وقتے میتواں گفت گو "داناں مداں نباشد" نشان زدہ عبارت ٹھیک اسی طرح ہے یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے؟"

قاضی صاحب مآثر غالب تصحیح اور اضافے کے بعد دوبارہ شائع کرنا چاہتے تھے[1] لیکن اپنی دوسری مصروفیات اور پھر طویل علالت کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد مجھے اس کتاب کی نایابی کی وجہ سے دوبارہ چھپوانے کا خیال ہوا۔ اسے جوں کا توں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا (حالاں کہ اس کی بھی اہمیت ہے) خیال ہوا کہ کسی طرح ڈھاکا کے مجموعے تک رسائی ہو جائے تو ممکن ہے متن کی بعض تصحیفات و تحریفات کی اصلاح ہو جائے، لیکن متعدد احباب کی طرف رجوع کرنے کے بعد بھی کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہ ضروری اس لیے ہے کہ میرے سامنے غالب کے اصل خطوط تو کجا نقل در نقل بھی موجود نہیں۔ غالب نے خطوط لکھے، شائق نے انھیں ایک مجموعے کی شکل میں محفوظ رکھا۔ یہ امر بھی یقینی نہیں کہ ڈھاکے کا مجموعۂ خطوط

---

[1] اپریل یا مئی ۱۹۵۱ء میں ضمیمے کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا۔ ۱۰ مئی ۱۹۵۱ء کو میں نے انھیں لکھا ہے: "کل ۹ کو آپ کا خط ملا خوشی ہوئی کہ ضمیمۂ مآثر کی کتابت آپ نے شروع کرا دی۔ آپ چھپوانے لگیں تو مطلوبہ تعداد سے ۱۵ نسخے فاضل چھپوا لیجیے گا۔"

خود شائق کا نقل کردہ ہے یا انھوں نے اسے کسی اور سے لکھوایا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی یہ خطوط مرتب کرتے تو ان کے سامنے شائق کا مجموعہ ہوتا جس سے وہ استفادہ کر سکتے۔ قاضی صاحب کے سامنے تو وہ بھی نہیں، انھیں حکیم صاحب سے کسی متصدی کے ہاتھ کی نقل ملی ہوگی یہ بھی ثابت نہیں کہ حکیم صاحب نے یا ڈاکٹر شادانی نے نقل کا اصل سے مقابلہ کر کے بھیجا ہو۔ اس طرح نقل در نقل میں غلطیوں کے در آنے کا خاص امکان ہے[1]۔

میں نے دو تین سال ہوئے ڈھاکے کا ایک سفر بھی کیا جس کا بڑا مقصد اس مجموعے کا عکس حاصل کرنا تھا، لیکن تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ مجموعہ مل نہ سکا۔ ڈھاکا یونی ورسٹی لائبریری میں یہ موجود نہیں۔ حکیم صاحب کے کتب خانے کی کتابیں منتشر ہوگئیں، کچھ ڈھاکا کی لائبریری میں آگئیں، کچھ کراچی اور دوسرے مقامات پر پہنچ گئیں۔ اس کا امکان ہے کہ یہ نسخہ ڈاکٹر شادانی کے پاس رہ گیا ہو (۱۰ ستمبر ۱۹۵۲ء تک تو ان کے پاس رہنے کا ثبوت ہے) اور ان کی وفات کے بعد ان کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ کہیں منتقل ہوگیا ہو بہر حال مآثرِ غالب کے مندرجات اور قاضی صاحب کے حواشی کی وجہ سے اس کی بہت اہمیت ہے اور میں اس کی اشاعت سے غافل نہیں ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند نے قاضی صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"تحقیق کی صحت اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے وہ ایک مثالی محقق ہیں، ایسے تبحرِ علمی، ایسے مطالعے اور ایسی نظر والی شخصیتیں قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے شخص کی ایک ایک سطر محفوظ کر دینی چاہیے۔"

دیوانِ جوشش کے بعد مآثرِ غالب قاضی صاحب کی دوسری کتاب ہے جس کی ترتیب و تحشیے پر انھوں نے پوری توجہ کی ہے بعد کو تذکرۂ ابن طوفان بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ ورنہ جو دوسرے متون انھوں نے شائع کیے ہیں ان میں سے بیشتر کا حال یہ ہے کہ کسی کا مقدمہ غائب ہے، کسی کتاب میں تمہید ملتی ہے تو حواشی و تعلیقات موجود نہیں ہیں۔ وعدے انھوں نے کیے کہ بعد کو لکھے جائیں گے لیکن ان کا ارادہ کبھی فعل کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ اس لحاظ سے مآثرِ غالب کی اہمیت مسلّم ہے۔

[1] کچھ یاد آتا ہے کہ انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ خطوط انھوں نے خود نقل کیے تھے یا تو ڈھاکہ گئے ہوں گے یا حکیم صاحب نے اپنا نسخہ پٹنہ بھیج دیا ہوگا۔

قاضی صاحب کے یہ پانچ وہ مضامین ہیں جو انھوں نے میری فرمایش پر سپرد قلم کیے اور جنھیں میں نے اپنی ادارت کے دوران میں مسلم یونی ورسٹی کے علی گڑھ میگزین کے دو شماروں میں شایع کیے۔ ان مضامین کے بعد غالب پر مضامین لکھنے کا جو سلسلہ انھوں نے شروع کیا وہ ان کی زندگی کے اس دور تک جاری رہا جب تک وہ تحقیقی کاموں میں مصروف رہے اور جب تک ان کی صحت نے اجازت دی۔ یہاں غالبیات کے سلسلے میں ان کے ان مطبوعہ مضامین کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن کا اب تک مجھے علم ہو سکا ہے۔ یہ فہرست جامع نہیں کہی جا سکتی۔ ان کے کچھ ایسے مضامین ضرور ہوں گے جو میری نظر سے نہیں گزرے یا جن کی اشاعت کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ مضامین کی فہرست الفبائی ہے۔ اس کی ترتیب میں معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۱۔ ایک رسالہ از مرزا غالب مطبوعہ سہ ماہی معاصر (پٹنہ) حصہ ۳۔
(سوالات عبدالکریم کا متن چھاپ دیا ہے، نہ تمہید ہے نہ حواشی۔

۲۔ یادِ مخالف کی اولین روایت اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن میسلنی بمبئی ۱۹۴۸ء

۳۔ بُرہان قاطع اور ہندستان (۲ قسطیں) رسالۂ نوائے ادب (بمبئی) اکتوبر ۱۹۶۳ء، اپریل ۱۹۶۵ء۔ (قسطِ ثانی کے آخر میں درج ہے کہ کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں، اس مقالے کی قسطِ ثالث میں وہ درج ہوں گے اور اہم اغلاط کی تصحیح بھی کر دی جائے گی، یہ قسط شائع نہیں ہو سکی)۔

۴۔ تیغِ تیز فکر و نظر (علی گڑھ) جولائی ۱۹۶۱ء

۵۔ خارش اور خماش اور غالب معاصر حصہ ۱۲ (اپریل ۱۹۶۰ء)۔
(یہ غالب کے شاگرد حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی (متوفی ۱۲۹۱ھ) کی نظم و نثر فارسی کا مجموعہ ہے جو مطبع اخبار آصفی حیدر آباد میں ۱۳۰۲ھ میں چھپا۔ اس مضمون میں اس کتاب کا تعارف ہے اور غالب کے نام ذکا کے ۱۱ فارسی خطوط کلاً یا جزءً درج کیے گئے ہیں۔

۶۔ خطبۂ افتتاحیہ بین الاقوامی غالب سمینار ۱۹۶۹ء دہلی (بزبان انگریزی) روداد مرتبہ یوسف حسین خاں دہلی ۱۹۷۰ء

۷۔ درفش کاویانی (طبع لاہور) آجکل (دہلی) مارچ ۱۹۷۲ء
پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے اڈیشن کا تعارف

۸۔ دساتیر نقوش اپریل ۱۹۶۶ء

۹۔ دیوانِ غالب کے دو نسخے ۲ قسطیں معاصر ۱۲، ۱۳
(اس میں نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا تفصیلی تعارف ہے اور نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ کر کے اختلافات متن درج کیے گئے ہیں)۔

۱۰۔ شمشیر تیز تر نقوش اگست ۱۹۶۱ء
(طبع ۱۸۶۷ء دہلی کا تعارف)

۱۱۔ عہدِ شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب معاصر حصہ ۵

۱۲۔ غالب بحیثیت محقق علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء
(یہی مضمون اضافات و تصحیحات و ترمیمات کے بعد نقد غالب شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا)۔
(یہ مضمون قاضی صاحب نے ۲۵ر مارچ ۱۹۴۹ء کو مکمل کر کے مجھے بھیج دیا تھا)

۱۳۔ غالب اور بہار رسالہ مطالعہ پٹنہ جنوری، فروری ۱۹۶۹ء۔

۱۴۔ غالب اور زال فارسی آجکل (غالب نمبر) فروری ۱۹۵۲ء یہی مضمون "گنجینۂ غالب" (دہلی) میں بھی شائع ہوا۔

۱۵۔ غالب اور "تنئیں" ؟ (کس رسالے میں اور کب شائع ہوا معلوم نہ ہو سکا)۔

۱۶۔ غالب اور خان آرزو صبح (دہلی) شمارہ ۱، ۱۹۶۱ء۔

۱۷۔ غالب کا عروضی اعتراض رسالہ ندیم، ڈھاکا جنوری ۱۹۶۰ء۔

۱۸۔ غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ فکر و نظر اپریل ۱۹۶۰ء
(مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ دیوانِ فارسی کے ایک نسخے کا تفصیلی تعارف۔ یہ نسخہ میرے خیال میں نواب فخر الدین خاں خرد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے)

۱۹۔ غالب کے بارے میں بعض وضاحتی امور نقوش فروری ۱۹۶۹ء۔

۲۰۔ غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام آجکل اگست ۱۹۵۲ء۔

۲۱۔ غالب کے کلیاتِ نظم فارسی کا قدیم ترین موجودہ نسخہ مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)۔ دسمبر ۱۹۶۰ء۔
(کلیات مکتوبہ لالا چھج مل در ۱۲۵۴ھ مخزونۂ کتب خانۂ خدا بخش کا تعارف

۲۲۔ غالب کی غزل گوئی کے پانچ دَور مطالعہ (پٹنہ) جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

۲۳۔ "غالب کے فارسی خطوط کا ایک نیا مجموعہ" ماہ نو (کراچی) جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

۲۴۔ غالب نے اردو میں خط کتابت کب سے شروع کی مصنف (علی گڑھ) ستمبر ۱۹۴۴ء

۲۵۔ کلیاتِ فارسی کا نسخۂ خدا بخش رسالہ اردوئے معلّٰی (دہلی) فروری ۱۹۶۰ء۔
(نسخۂ مکتوبہ ۱۲۵۷ھ کا تعارف)۔

۲۶۔ متفرقات (متعلق بہ غالب) نقوش جنوری ۱۹۵۷ء

۲۷۔ متفرقات (غالبیات) نقوش اکتوبر ۱۹۵۸ء

۲۸۔ مجموعۂ دہلی (نیشنل آرکائیوز دہلی کا مجموعۂ خطوط) ماہ نو (کراچی) فروری ۱۹۶۵ء (؟)

۲۹۔ مجموعۂ دہلی اور غالب رسالۂ اردو (کراچی) جنوری، مارچ ۱۹۶۲ء

۳۰۔ مقالۂ افتتاحیہ بین الاقوامی سیمینار دہلی ۱۹۶۹ء بزبان اردو روداد غالب سیمینار مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین دہلی ۱۹۶۹ء

۳۱۔ مکتوبات غالب
اس میں مجموعۂ دہلی کے خطوط فارسی کے متن کے ابتدائی ۱۴ اوراق بغیر تمہید و حواشی کے شائع ہوئے ہیں۔ اشارات میں اطلاع دی گئی ہے کہ "مکتوبات غالب کے بیشتر خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خطوط باقساط شائع ہوں گے اور آخری قسط کے ساتھ مقدمہ و حواشی ہوں گے۔" "تحقیق" قاضی صاحب کے قائم کردہ ادارۂ تحقیقاتِ اردو کا رسالہ تھا جس کے مرتب قاضی محمد سعید تھے اور جو قاضی صاحب کی نگرانی میں ۱۹۶۱ء میں پٹنہ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ افسوس اس کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ اس لیے، غالب کے فارسی خطوط کی دوسری قسطیں شائع ہوئیں نہ مقدمہ و حواشی۔
اس مجموعے سے خطوط کی ندرت کی وجہ سے قاضی صاحب کی گہری دلچسپی تھی اور

اس پر ان کے تین مضامین شائع ہوئے۔ دیکھیے اندراجات : ۲۷، ۲۸، ۲۹ اور ۳۱
وہ ان خطوط کو خود مرتب کر کے ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے شائع کرنا چاہتے
تھے لیکن اس کی ترتیب و اشاعت کا قرعہ سید اکبر علی ترمذی صاحب کے نام نکلا جنھوں
نے اس گمنام مجموعۂ خطوط کو دریافت کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مجموعے پر ایک سیر
حاصل مضمون لکھ کر اس کا تعارف کرایا اور مشفق خواجہ صاحب نے اپنے رسالۂ اردو (کراچی)
کے دو شماروں میں شائع کیا۔ ترمذی صاحب نے یہ خطوط مرتب کر کے ۱۹۶۹ء میں دہلی
سے شائع کر دیے ہیں اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ۔ انھوں نے غالب کے ہر خط کا
خلاصہ بھی انگریزی میں دے دیا ہے جس سے افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۳۲۔ محرق قاطع برہان نوائے ادب اپریل ۱۹۶۲ء۔
(یہ رسالہ جو سید سعادت علی نے غالب کی قاطع برہان کے جواب میں لکھا تھا۔
۱۲۸۰ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اس رسالے کا تعارف ہے اور مندرجات
پر قاضی صاحب کی رائیں)۔

۳۳۔ میر صغیر علی بلگرامی اور مرزا غالب رسالۂ اردو جنوری ۱۹۳۸ء
میرے ذخیرۂ کاغذات میں قاضی صاحب کی تین تحریروں کے مسودات ہیں۔

۳۴۔ غالب اور عروض ۱۰ صفحات تقطیعِ خرد مضمون ممکن ہے انھوں نے غالب نمبر
کے لیے دیا ہو اور اس میں کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا ہو۔

۳۵۔ "سبدِ چین" مالک رام صاحب کے اڈیشن (دہلی ۱۹۲۸ء) پر تبصرہ ہے۔ یہ جہاں تک
یاد آتا ہے انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے والے تیسرے مجموعے "گنجینۂ غالب"
کے لیے انھوں نے عنایت کیا تھا لیے میں نے مصنف (علی گڑھ) میں اشاعت کے لیے دے دیا تھا۔

۳۶۔ غالب کی عروض دانی پر قاضی صاحب کے ایک اور مضمون کا مبیضہ ان کے قلم کا ہے، یہ
پہلے مضمون سے طویل ہے۔ اس میں بعض مقامات پر سطر دو سطر کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، وہ
کچھ لکھنا چاہتے ہوں گے لیکن اس کا موقع انھیں نہیں مل سکا۔ یہ تیسرا مضمون اس وقت
پیشِ نظر نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ یہ پہلے مضمون کی آخری شکل ہے، یا دونوں علیحدہ

علیحدہ مضامین ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب کے خطوط نکال کر دیکھنے کا موقع نہیں، اُن سے ان مضامین پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

۲۷۔ قاضی صاحب کا ایک مضمون "استر اور غالب" کے عنوان سے چھپا ہے لیکن فی الحال معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں شائع ہوا ہے اور کب۔

قاضی صاحب نے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے غالب کی تصانیف پر تبصرے پہلے لکھے، غالب پر مقالات کا سلسلہ انھوں نے بعد کو شروع کیا۔ ان کا لکھا ہوا پہلا تبصرہ جنوری ۱۹۴۳ء میں چھپا جب کہ غالب پر پہلا مقالہ فروری ۱۹۴۸ء میں انھوں نے لکھا۔ ان کے ابتدائی تبصرے حسبِ ذیل ہیں:

نادر خطوطِ غالب مرتبۂ محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی رسالۂ معاصر (ماہوار) جنوری ۱۹۴۳ء
اس مضمون کی تمہید میں قاضی صاحب نے تحریر کیا ہے: "راقم کا ارادہ ہے کہ تصانیف غالب کی جدید اشاعتوں اور غالب سے متعلق نئی کتابوں پر تفصیل تبصرہ کیا جائے لیکن اس کے لیے ایک مضمون نہیں سلسلۂ مضامین درکار ہے۔"

مکاتیب غالب مرتبۂ مولانا امتیاز علی عرشی ؛ معاصر (ماہوار) مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۴۳ء۔

خطوط غالب مرتبۂ مہیش پرشاد معاصر (ماہوار) اکتوبر ۱۹۴۲ء، جولائی ۱۹۴۴ء۔

فرہنگ غالب مرتبۂ مولانا امتیاز علی عرشی علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء۔

سبد چیں مرتبۂ مالک رام معتقف علی گڑھ ستمبر ۴۸ ۱۹ء

بعد کو جو تبصرے انھوں نے لکھے اور جو سہ ماہی معاصر (پٹنہ) میں شائع ہوئے حسبِ ذیل ہیں:

نادرات غالب مرتبۂ سیّد آفاق حسین دہلوی سہ ماہی معاصر حصّۂ ۱
ذکر غالب (اشاعت ۲) مرتبۂ مالک رام سہ ماہی معاصر حصّۂ ۲

مطالعۂ غالب　　مصنفۂ　　مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سہ ماہی معاصر حصّہ ۵

احوالِ غالب　　مرتبۂ　　مختار الدین احمد　　سہ ماہی معاصر حصّہ ۹

غالبیات کے سلسلے میں میرے خیال میں قاضی صاحب کا سب سے اہم کام "جہانِ غالب" ہے جو افسوس ہے کہ مرتب ہو کر اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ یہ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے رجالِ غالب نہیں بلکہ وسیع موضوعات پر مشتمل دائرۂ معارف نہ سہی، ایسی قاموس ضرور ہے جس میں غالب کے سلسلے میں مختصر اور طویل ہزاروں اندراجات ہوں گے۔

موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنے بعض احباب میں، جنھیں تحقیقی کاموں سے عام طور پر اور غالب پر خاص طور پر دلچسپی ہو، کام تقسیم کر دینے اور ان سے مضامین اور اندراجات لکھوانے کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے متعدد اصحاب کو خطوط لکھے، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ انھوں نے مجھے بھی متوجہ کیا تھا[۱] اور میں نے بعض عنوانات پر لکھنا منظور بھی کر لیا تھا، لیکن بعد کو اس راہ کی مشکلات کا اندازہ ہوا۔ خاص طور پر جب ان تحریرات کو قاضی صاحب کی کتاب میں درج ہونا تھا۔

بہر حال قاضی صاحب نے تنِ تنہا سینکڑوں موضوعات پر اپنے نوٹس لکھ ڈالے اور بیشتر، مختلف رسالوں میں چھپوا دیے۔ ان میں سطر دو سطر کے نوٹس بھی ہیں اور بہت مفصل مضمون بھی۔ رضا علی خاں ہدایت کی کتاب فرہنگِ انجمن آرائے ناصری پر ۴۲ صفحوں کا مضمون ہے جو رسالۂ معاصر کے حصّہ ۹ میں چھپا ہے۔

میں نے جہانِ غالب کی بیشتر قسطیں جمع کر لی ہیں، یا ان کے عکس حاصل کر لیے ہیں۔

۱؎ جہانِ غالب کا خیال انھیں ۱۹۵۰ء میں یا اس سے بھی پہلے آیا۔ میں نے ۸ فروری ۱۹۵۰ء کے مکتوبہ ایک خط میں ان سے پوچھا ہے۔ "جہانِ غالب میں کیا ہوگا۔ کس قسم کے مضامین ہوں گے۔ ٹکڑے ٹکڑے شائع کرنے والی اسکیم بہت اچھی ہے۔" ۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو میں نے انھیں لکھا ہے "میں نے آپ سے "جہانِ غالب" کے عنوان کے تحت آپ کی ہدایات کے مطابق لکھنے کا وعدہ کیا تھا، اب ایفا کے لیے تیار ہوں، کچھ عنوانات بتائیے، کچھ میرے ذہن میں ہیں اور میں مواد جمع کر رہا ہوں۔"

مجھے قاضی صاحب سے کچھ غیر مطبوعہ مواد بھی ملا ہے، یہ ساری تحریریں مرتب کرکے کتابی شکل میں انشاءاللہ آیندہ سال شائع کردی جائیں گی۔

قاضی صاحب نے غالب پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی لیکن مضامین ان کے قلم سے اتنے نکلے ہیں کہ ایک کتاب غالب کی زندگی پر اور ایک ان کی تصانیف پر شائع کی جاسکتی ہے۔ غالب کی کُل تصانیف نظم و نثر کا ایک اعلیٰ تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا انھوں نے بہت مفید اور جامع منصوبہ بنایا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس وقت بہار کے گورنر اور پروفیسر کلیم الدین احمد ڈپٹی ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تھے۔ ان لوگوں کی توجہ سے حکومت بہار نے قاضی صاحب کے علمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک گراں قدر رقم ان کے قائم کردہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کو دینا منظور کرلیا۔ کام شروع ہوا لیکن افسوس ہے کہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" کی پہلی جلد (مشتمل بر متون قاطع برہان، سوالات عبدالکریم، لطائف غیبی، نامۂ غالب اور تیغ تیز) ۱۹۶۷ میں انطباع پذیر ہوئی لیکن دوسری جلد جس میں قاضی صاحب کے لکھے ہوئے حواشی و تعلیقات اور ان کے مرتب کیے ہوئے اشارات وغیرہ درج ہوئے تھے ایک زمانہ گزرنے کے بعد بھی شائع نہ ہوسکی۔

قاضی عبدالودود کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین میں ماضی و حال کے مصنفین و شعرا کے صرف منفی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ نہ ان کی تحریرات نظم و نثر کے حسن و خوبی سے بحث کرتے ہیں نہ ان کے لیے تعریف و تحسین کے کلمات استعمال کرتے ہیں۔ اس خیال میں جزوی صداقت ہے کلی نہیں۔ ان کا قلم اگر تعریف و توصیف کے معاملے میں محتاط ہے۔ اور احتساب میں بہت سخت، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بُروں کو بُرا نہ کہنا، اچھوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ مصنفین و شعرا کے بارے میں توصیفی کلمات انھوں نے بالکل نہ کہے ہوں اور ان کے نتائج فکر کی کبھی داد نہ دی ہو۔

وہ غالب کی شاعری، شاد کی غزل گوئی، عبدالحق کی نثر، شیرانی کی تحقیق، کلیم الدین احمد کی تنقید، عبدالستار صدیقی کے وسعت مطالعہ کے مداح تھے۔ ایرانیوں میں وہ قزوینی کے بڑے معترف تھے۔ ریسرچ کے سلسلے میں وہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا ذکر کرتے تھے اور ہمیشہ

اچھے لفظوں میں۔ وہ بعض وجوہ سے انھیں ڈاکٹر ہادی حسن اور ڈاکٹر وحید مرزا پر ترجیح دیتے تھے۔ نسبتہً کم عمر لوگوں میں وہ مشفق خواجہ اور رشید حسن خاں کے ذوقِ تحقیق اور ان کی کارکردگی سے خوش تھے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں دہلی میں غالب کی صد سالہ یادگار کی تقریب منائی گئی جس میں ایک بین الاقوامی غالب سیمنار بھی منعقد ہوا۔ قاضی صاحب نے اس میں اپنا افتتاحیہ خطبہ پڑھا۔ اصل خطبہ تو ہمارے سامنے نہیں، غالباً کبھی شائع نہیں ہوا، لیکن اس کی ترمیم شدہ شکل ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے اس مرتب کردہ مجموعے میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں سیمنار کے مقالات شائع ہوئے ہیں۔

۵۵ صفحوں کے خطبۂ افتتاحیہ میں ۱۴۱ پیراگراف ہیں، لیکن اس میں غالب کی تحسین و توصیف یا ان کی نثر و نظم کی خوبیوں کے ذکر میں ۵ سطروں کا ایک پیراگراف بھی نہیں۔

قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ میرے خطبے کا موضوع غالب کے حالات کے مآخذ و مصادر ہیں۔ لیکن بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر و مصنف کے سمینار میں جو خطبہ افتتاحیہ پڑھا جائے اس میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کے محاسن پر تو گفتگو ہونی ہی چاہیئے۔ بہرحال قاضی صاحب نے اس کمی کی تلافی مجموعۂ مقالات کے انگریزی مجموعے میں کردی ہے۔ اس مجموعے میں ۱۴ انگریزی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی تمہید کے بعد قاضی صاحب کا خطبۂ افتتاحیہ ہے۔ جو صرف دو صفحوں پر مشتمل۔ پہلا پورا صفحہ غالب اور ان کے عقیدت مندوں کی تنقید کے لیے وقف رہا لیکن دوسرے صفحے کے دو پیراگراف میں قاضی صاحب نے اپنی عام روش سے ہٹ کر غالب کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے اور انھیں کلماتِ تحسین سے نوازا ہے۔

قاضی صاحب کی ادبی زندگی کے ساٹھ پینسٹھ سال کے عرصے میں یہ شاید پہلا موقع ہو جب انھوں نے کسی شاعر یا مصنف کی اس طرح تحسین کی ہو جس طرح انھوں نے غالب کی کی ہے۔ میں تو اسے مرزا اسداللہ خاں غالب کی کرامت سمجھتا ہوں۔

ذیل میں قاضی صاحب کی انگریزی عبارت کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے اور اسی پر

یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے :

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اشیا کو ویسی ہی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جیسی کہ وہ ہیں، نہ کہ جیسی کہ میری خواہش ہے۔ مجھے جانسن کی رائے سے اتفاق ہے کہ غلو آمیز تعریف اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہے، اور میں والٹیر کا ہم خیال ہوں کہ مردوں کا جو حق زندوں پر ہے وہ یہ کہ وہ ان کے بارے میں سچ بات کہیں۔

میں غالب کو اردو کے عظیم شاعروں میں شمار کرتا ہوں اور اسے عظیم ترین مکتوب نگار سمجھتا ہوں۔ طنز و مزاح کے فن میں کوئی اردو مصنف ان کا ہم پلہ نہیں ہے۔ بحیثیت شاعر ان کا دائرۂ کار اپنے معاصرین اور متقدمین سے فزوں تر ہے۔ ان کی شاعری میں خیال اور جذبے کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ وہ ہمارے دکھ درد کو ہموار کرتے ہیں زندگی سے ہماری لذت یابی میں اضافہ کرتے ہیں اور ہمیں دوسروں کے آلام و مصائب سے ہمدردی کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ وہ کوئی باضابطہ مفکر نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے خیالات کو اپنے معاصرین اور متقدمین کی نسبت زیادہ برانگیختہ کرتے ہیں۔ مزید براں ان کی شاعری ہماری بصری اور سماعی تسکین کے لیے وافر سامان فراہم کرتی ہے۔ اگر کسی شاعر میں یہ سب خوبیاں پائی جائیں، تو میں اسے نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہوں۔"

استدراک

ص۱ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے پروفیسر براؤن کی نگرانی میں علی بن ربن الطبری کی فردوس الحکمۃ مرتب کی جس پر انھیں عربی میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں برلن سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد نظام الدین (صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونی ورسٹی) نے براؤن ہی کی نگرانی میں عوفی کی "جوامع الحکایات" پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر فارسی میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ان کا مقالہ

گب میموریل سیریز لندن سے شائع ہوا۔ پروفیسر آصف علی اصغر فیضی کیمبرج میں قاضی صاحب کے معاصر تھے۔ انھوں نے بعد کو "دعائم الاسلام" مرتب کرکے قاہرہ سے شائع کرایا۔

صت ۲۹، ۳۰ عندلیب شادانی نے اگر مجموعۂ ڈھاکہ کے خطوط غالب پر کچھ لکھا تو وہ شائع نہیں ہوا۔ ہاں ان کا "پنج آہنگ" میں مرزا کے اسلوب نگارش پر ایک مضمون رسالۂ صحیفہ لاہور (جنوری ۱۹۶۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ شمارہ اس وقت پیش نظر نہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس کا ذکر اپنے تبصرے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: عندلیب شادانی مرحوم کا یہ شاید آخری مطبوعہ ادبی یادگار ہے جو "صحیفہ" میں محفوظ ہوئی ہے۔ انھوں نے پنج آہنگ میں مرزا کے اسلوب نگارش پر لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غالب ابوالفضل سے متاثر تھے، پرچھانواں البتہ بیدل کا بھی ہے اور ابوالفضل کے بھی خاص طور سے اس اسٹائل سے جو "آئینِ اکبری" میں ہے۔ پھر آئین کے اسٹائل کا تجزیہ کیا ہے اور خصوصیات دی ہیں جو بآسانی غالب کے یہاں مل جاتی ہیں۔ آخر میں صفحہ بھر میں بیدل کے معمولی اثر کے بھی ثبوت دیے ہیں۔ غالبیات نو حصۂ دوم صت ۲۴ (دہلی ۱۹۷۰ء)۔

صت ۴۵ مضمون کی کتابت کے بعد تصحیح کے دوران قاضی صاحب کے دو مزید مضامین کا پتا چلا۔ "قاطع القاطع" مؤلفۂ امین الدین برہان کا مضمون رسالۂ صحیفہ (لاہور) کے غالب نمبر (جنوری ۱۹۶۹ء) مرتبۂ وحید قریشی، کلب علی فائق میں شائع ہوا ہے۔ ان کا دوسرا مضمون لفظ "بر پروشان" کی تحقیق پر رسالۂ آجکل (دہلی) کے دسمبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں چھپا ہے۔ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، یہ اطلاع اشاریۂ آجکل مرتبہ جمیل اختر (دہلی ۱۹۸۸ء) سے ملی ہے۔ اس لفظ کی بحث قاضی صاحب نے مختصر طور پر "غالب بحیثیت محقق" (نقد غالب صت ۲۲۳۔ صت ۲۲۵) میں کی ہے، بعد کو انھوں نے اس لفظ کی تحقیق پر مستقل مضمون لکھا۔ اس مضمون کے مسودے کے چند اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس لفظ پر بہت اچھی گفتگو ڈاکٹر نذیر احمد نے کی ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔ دیکھیے نقد قاطع برہان صت ۶۲۔ صت ۶۳۔ شائع کردۂ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۸۵ء۔

اس طرح غالب پر قاضی صاحب کے مضامین کی تعداد ۴۹ ہو جاتی ہے۔

صت ۴۲ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اطلاع دی ہے کہ قاضی صاحب کا مضمون "استر او رغالب" (جس کا ذکر صت ۴۶ پر گزرا) رسالۂ اشارہ (پٹنہ) آزادی نمبر (اگست ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے از راہ کرم اس مضمون کی عکسی نقل بھی فراہم کی ہے، ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

[illegible]

قاضی صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ

(برائے گنجینۂ غالب)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

غالب کی شاعری میں شعلے کا رمز

تقریباً ہر منفرد اور ممتاز شاعر کے ہاں کوئی نہ کوئی بنیادی پیکر یا پیکروں کا نظام برابر مستعمل ہوتا ہے۔ جس سے اس کے مزاج اور ادراک کے بارے میں ایک اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کے ہاں بالعموم حرکی پیکروں کی فراوانی ہے۔ اور اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں حرکیت اور توانائیت کے عناصر قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ عناصر نہ صرف ان کے مزاج کی غمازی کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی فکر کی نوعیت کو بھی واضح کرتے ہیں۔ غالب کے ہاں اس کے برعکس بصری پیکر بہت نمایاں ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ اور متداول دیوان دونوں میں ایسی غزلیں بکثرت موجود ہیں، جن میں یہ پیکر تواتر کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک بہارستان ہے جو ہر چہار طرف ہمیں حواس کی زد پر رکھتا ہے جب ہم بعض عناصر خمسہ پر مبنی مخصوص پیکروں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اور دوسرے پیکر جو ان سے مختلف حواس سے منسلک ہیں، موجود نہیں ہیں۔ کیوں کہ شاعری میں حواسی تلازمات کو نمایاں کرنے کے لیے سب ہی طرح کے پیکروں سے کام لیا جاتا ہے غالب کے ہاں حواسی تلازمات میں ایک تعقلی عنصر بھی شامل نظر آتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر حسی پیکروں کے سہارے بھی بڑی شاعری کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔ ایسے

موقع پر تصورات ایسی توانائی رکھتے ہیں کہ وہ حسی پیکروں پر تکیہ کیئے بغیر شعر کا جادو جگا سکتے ہیں۔ ایسی مثالیں اقبال کے ہاں بھی ہیں اور برطانوی شاعروں میں مارول اور ایلیٹ کے ہاں بھی۔ بعض شاعروں کے ہاں محاورے کے موزوں اور برمحل استعمال سے ہنرمندی کے ساتھ کام لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری فی الاصل بڑی متنوع تخلیق ہے اور اس کے شیوں اور اظہار کے اسالیب اتنے مختلف ہیں کہ ان کے لیے کوئی ایک تعریف کفایت نہیں کرتی۔ غالب اور اقبال دونوں کے ہاں فکر کا عنصر بنہایت حاوی ہے، اور محاورے کی چاشنی نہ ہونے کے برابر۔ غالب کے مزاج میں جو تب و تاب اور توانائی ہے، اس کا اظہار ان کے ہاں محاکات یا پیکروں کے گوناگوں استعمال سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں جو پیکر برابر استعمال کیے گئے ہیں وہ ہیں آئنہ، بلبل، طاؤس، طوطی، شمع، آتش اور موخرالذکر کے تلازمات یعنی شعلہ شرار اور برق وغیرہ۔ آگ سے تقدیس کا جذبہ بھی وابستہ ہے اور اس میں اور شعلہ، شرار، اور برق میں نہ صرف حدت وحرارت، بلکہ چمک اور تابندگی، لمحاتی اور ہنگامی ضو افگنی اور اضطراب و تموج بھی۔ چنانچہ شعلۂ جوالہ اسی کی تخصیصیت کا اظہار ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آغازِ کار سے آتش یا آگ ان چار عناصر میں شمار کی جاتی رہی ہے، جن پر تکوین کے عمل کا انحصار ہے، یہ عناصر ہیں: آب و خاک و باد و آتش۔ موخرالذکر اہم ترین عنصر ہے اور یہ سوختنی کے علاوہ تطہیر حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اسے دوسرے عناصر ترکیبی پر ایک طرح کا تفوق اور برتری حاصل ہے۔ فلاسفۂ یونان میں سے Heraclitus کا کہنا ہے کہ یہ تخلیق کے قلب میں موجود ہے۔ ان چاروں عناصر سے تعلق اور ان کی پاسداری یعنی ان کا شعری استعمال ایسے مختلف اور متضاد فطانت اور رویہ رکھنے والے شاعروں کے ہاں مل جائے گا، جیسے مثلاً اٹھارویں صدی کے برطانوی شاعر پوپ اور جدید شاعر ٹی، ایس، ایلیٹ کے کارناموں میں۔ یہ قیاس کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ آتش سے غالب کی یہ دلچسپی ان کے تحت الشعور میں موجود ایرانی روایت کی وجہ سے ہوگی۔ جس میں آگ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک ابتدائی غزل میں کہا بھی ہے:

دلم معبود زردشت است غالب فاش میگویم ــــ بہ خس یعنی قلم من دادہ ام آذر فشانی ہا

زرتشتی مجموعۂ عقائد کی تو بنیاد ہی آتش پرستی پر رکھی گئی ہے۔ گاتھاؤں میں یاسنا (۲۱۰۳) میں یہ التجا کی گئی ہے کہ آشا وان (حق کے داعی) اور ڈریگ وانٹ (دروغ پرور غلانے والے) دونوں کو آتش کی روح کے وسیلے سے مسرت عطا کی جائے۔ ویدک رشیوں کے ذہن میں بھی اگنی کا تصور موجود تھا۔ غالب ایرانی النسل تھے۔ اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ ان کے لاشعور میں اس تصور کی باقیات موجود رہ گئی ہوں کہ کائنات میں جتنے مظاہر ہیں، ان میں کم و بیش یہ رُوح سرایت کیے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری میں آتش وابستہ ہے عشق کی قوت سے اور محبوب اس کی ایک حسی تجسیم ہے۔ وہ ایک شعلۂ جوالہ ہے، جو انسان کو حالت تموج و اضطراب میں رکھتا ہے۔ نہ صرف شعلہ و شرر ایک دوسرے سے منسلک اور پیوستہ ہیں۔ بلکہ برق بھی ان سب سے ایک زیر زمین علاقہ رکھتی ہے۔ اور یہ تینوں عاشق کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ انھیں اپنی سرشت میں لیے ہوئے ہے یا چھپائے ہوئے ہے۔ جب عشق صادق کا جذبہ شخصیت میں تحریک پیدا کرتا ہے تو اس سے شرر باری یا شعلہ آفرینی نمایاں ہوتی ہے۔ اور جب اسے دبایا جاتا ہے، تو شمع کشتہ کی مانند وہ سیاہ پوش ہو جاتا یعنی دھوئیں سے ڈھک جاتا ہے۔ رنگ کے تناظر میں گل کو اور اضطراب و تموج کے تناظر میں شعلہ و شرر کو غالب کے ہاں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آگ شخصیت کو جلا بخشتی اور اس کی تطہیر کا باعث بھی ہوتی ہے۔ غالب کے ہاں بالعموم نشاط کار کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ سرافگندگی اور جبیں سائی نہیں، جو مثال کے طور پر میر کے عاشق کا طرۂ امتیاز ہے۔ حیرت و حسرت البتہ ضرور ہے لیکن وہ نتیجہ شکستگی کا نہیں، بلکہ زانوے تامل کی کیفیت کا پیدا کردہ ہے۔ شعلہ، شرر، اور برق، تینوں عشق کے جذبے کی تندی اور اضطرار کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو اس کی سیمابیت اور لمحاتی پن کو بھی۔ لیکن اسے ہمیشگی اور استقلال حاصل نہیں کشاکش اور ایک طرح کا الجھاو اور آتار چڑھاو اس سے ضرور وابستہ ہے۔ اس میں عرصۂ حیات کی بے اعتباری کا رمز بھی پوشیدہ ہے۔ اس میں رنگ کا اشارہ تو ہے ہی لیکن شاید اس سے بڑھ کر توانائی اور سرکشی کا لحاظ زیادہ مضمر ہے۔ غالب کی دلچسپی آب و خاک سے زیادہ آتش میں ہے کہ یہ تطہیر کا وسیلہ بھی ہے اور

تقلیب کا بھی۔ آگ میں تپ کر شخصیت کندن بنتی اور شعلہ اسے حوصلۂ پرواز عطا کرتا ہے۔
زرتشتی روایت میں آگ نے تقدس وابستہ ہے۔ اسے SPENTA MAINYU
یعنی روح مطہر HOLY SPIRIT سے بھی ملحق کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے مظہر کی طرح متصور کی جا
سکتی ہے جو جسمانیت سے منزہ اور ماورا ہے۔ یہ ہماری شخصیت کے خلیوں میں سرایت
کر کے اس میں ایک نوع کی عفت اور نزہت پیدا کر دیتی ہے۔ جیساکہ شروع ہی میں کہا گیا
اس کا تفاعل جلا کر خاک میں ملانا نہیں، بلکہ جنس خام کو کندن بنانا ہے، یعنی تبدیلی ہیئت،
انگریزی ادب و ثقافت کی تاریخ میں اس سلسلے میں PARACELSUS کا نام لیا جاتا ہے۔
اور برطانوی شاعر ولیم بلیک نے بھی [illegible] پیکر نگاری کا استعمال اپنی شاعری
میں بڑے اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ جس میں F[illegible]ES کے لفظ کا استعمال ان تقلیبی اعمال
کے سلسلے میں بہت قابلِ توجہ ہے۔ اور ایلیٹ کی مشہور نظم [illegible] میں بھی ان تکوینی عناصر
سے عمیق معانی اور وسیع تلازمات قائم کیے گئے ہیں۔ دراصل مشرق اور مغرب دونوں خطوں کے
ادب میں آتش کا یہ رمز بلا تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کے مضمرات ثقافتی پس منظر
کے تفاوت کے باوجود قریب قریب یکساں ہیں۔ جس سے اس امر کا ثبوت فراہم ہوجاتا ہے
کہ بعض مرکزی موضوعات یا موتیف ایسے ہیں، جو ہر زمانے میں تخلیقی ذہن کے عمل کو متاثر کرتے
رہے ہیں۔

آتش اور شعلہ و شرر کے رموز سے غالب کو جو غیر معمولی شغف ہے، اس کا سرچشمہ
ان کی شخصیت کے تار و پود میں تلاش کرنا چاہیے۔ "ضربِ کلیم" میں مندرج ایک نظم بہ عنوان
"جلال و جمال" میں اقبال نے کہا ہے: "مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ
نہ ہو تند و سرکش و بے باک"، یہ ایک کلیدی اہمیت کا حامل شعر ہے۔ غالب کی ان عناصر
سے وابستگی ان کی طبیعت کی تندی، سرکشی اور بے باکی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی
ایسی شے یا مظہر کو قبول کرنے کی طرف میلان نہیں رکھتے، جس میں محض دیدہ زیبی، نرمی اور
دلآسائی ہو، وہ سرجوش، تندی اور بے باکی نہ ہو، جو ہمارے تسلیم شدہ مفروضات کے
لیے ایک کھلا چیلنج ہے۔ وہ ان کے گوارا، ہلکے پھلکے اور سریع الاثر پہلوؤں سے مطمئن

اور آسودہ نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک طرح کے کس بل، شرر افشانی اور اضطراب و ہیجان کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ غالب کے ابتدائی کلام یعنی نسخۂ حمیدیہ میں بہت سے استعارے مثلاً آئینہ، طوطی، شیشہ، مینا، پر طاؤس، کاغذی پیرہن ایسے ہیں جو ایرانی روایات سے لیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ آتش، شرر اور برق کا ماخذ بھی یہی روایت ہو۔ زرتشتی طریق زندگی کے ہر ہر پہلو میں موخرالذکر روایت کا عمل دخل ہے۔ اس کا تعلق محض عبادت کے طور طریقوں ہی سے نہیں، بلکہ معاشرت کے تمام مظاہر اور انفرادی اور اجتماعی برتاؤ میں اس کا انعکاس نظر آتا ہے۔ چنانچہ [illegible] میں جو براہِ راست تخلیق یا تکوین کائنات سے متعلق ہے اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ زندگی کے مرکز میں بھی ہے اور اس کی بیرونی سطح یعنی PERIPHERY پر بھی۔ اُردو شاعروں کے ہاں عموماً اس برق کا ذکر تو ملتا ہے جو خرمن سوز ہے اور آشیاں کو بھی جلاکر رکھ دیتی ہے۔ لیکن آتش اور شرارے کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ اور اس کے پسِ پشت کسی تفکر کا پتا نہیں چلتا۔ صرف ایک نجی واردات کا ترشح ہوتا ہے اور وہ بھی بالکل روایتی انداز میں۔ غالب کی دو فارسی غزلیں جن کے مطلع یہ ہیں :

سینہ بکشودیم و خلقے دید کہ کانجا آتشست
بعد ازیں گویند آتش راکہ گویا آتشست

اور

خوشا عالم ! تن آتش بستر آتش
سپندی کو کہ افشانم بر آتش

یہ تمام و کمال ہی رمز کی حامل ہیں۔ طریق اظہار کا یہ فرق غمازی کرتا ہے ادراک کے اس سانچے کے فرق کی جو غالب اور دوسرے اُردو شاعروں کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے۔ غالب کے ادراک کا سانچہ حسیّ تجربے کو فکر کے معمول میں ڈھال دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے اور [illegible] کا مورد بنایا جاتا ہے۔

اسی سے ایک طرح کی کثیر العناصری یعنی HETERUGEBEITY یا کثیر الجہتی یعنی MULTIT-UDINOUSNESS جنم لیتی ہے۔ جو اکہرے مفہوم میں محض تنوع نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شرر اور برق کا تعلق رنگ سے بھی ہے اور ایک طرح کی حرکت سے بھی۔ یعنی یہاں دونوں طرح کے امیج باہم دگر ہو جاتے ہیں۔ رنگ ایسا جس میں شدت اور ارتکاز پایا جاتا ہے، اور حرکت ایسی جس میں تلون اور سیمابیت مخفی ہے۔ اور آتش کا پیکر بعض دوسرے عناصر سے ترکیب پاکر یا ممزوج ہو اکثر اوقات بعض سیاق و سباق میں بہت بامعنی بن جاتا ہے۔ مثلاً کاغذِ آتش زدہ، جیسی ترکیب میں آتش ہی کے عمل کو سامنے نہیں رکھا گیا، بلکہ اس سے ایک طرح کی تبدیلیٔ ہیئت کو نمایاں کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں مختلف استعارے اور علائم ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ غالب کے ہاں ذہنی اور حواسی کیفیتیں ایک دوسرے میں اس درجے مدغم ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کا بیک وقت اظہار ایسا ہے، جسے آئینہ در آئینہ کہا جا سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اس پر روشنی کی ایک شعاع متداول دیوان کی پہلی ہی غزل کے مندرجہ ذیل شعر سے پڑتی ہے:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یہاں حالتِ اسیری میں اضطراب کی کیفیت کو آتش زیر پا ہونے کے امیج کے ذریعے متشکل کیا گیا ہے۔ اور زنجیر جس میں اشارہ اسیری کی طرف مضمر ہے اس کے ہر ہر حلقے کو موئے آتش دیدہ کے بصری مظہر کے توسط سے اور زیادہ تابناک مرتکز اور پر تشدید بنا دیا گیا ہے۔ دو اور شعر دیکھیے:

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اور سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پہلے شعر میں اندیشہ (جو تخیل کا ہم معنی یا متبادل ہے) کی حدت و حرارت اور اس کی آتشیں
قوت کا ذکر کر کے اس کے مرتبے کو بڑھایا گیا ہے۔ اور دوسرے میں 'رہن عشق'
اور 'الفت ہستی'، جو باہمدگر وابستہ ہیں، مثل برق کے ہیں، جن کا نقش قائم رہنا مشکل اور
اس لیے لایعنیت کے مترادف ہے۔ لایعنیت کے احساس کے مضمرات کو بیسویں صدی کے
وجودی فکر سے مختص کرنا کافی نہیں ہے۔ غالب کے ہاں اُنیسویں صدی میں بھی شعری فکر میں
یہ تصور کسی نہ کسی طرح موجود دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک پوری غزل ہیں جس کا مطلع ہے:

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

مرکزی نقطہ عاشق اور محبوب کے مخمصے یعنی PREVILAMENT کو آمنے سامنے رکھنا ہے۔
چنانچہ اس شعر میں 'برقِ سوزِ دل' اور "شعلۂ جوّالہ" نہایت درجے مضطرب صورتِ حال کی عکاسی
کرتے ہیں۔ اور آخر میں اس کیفیت کی ترسیل کے بالمقابل رنگ کا امیج بھی استعمال کیا گیا ہے!

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اس پوری غزل کو ایک طور سے اگر IMAGES CONTRAST کا نگار خانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔
اب ایک اور شعر دیکھیے جس میں ایک دوسری کیفیت جلوہ گر ہے، یہاں گفتگو صیغۂ تمنائی میں کی جا
رہی ہے اور یہاں MAXIMIZATION کی جگہ MINIMIZATION کا عمل ہمارے روبرو ہے:

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

جس غم کا ذکر ہے، وہ اگر واقعی عمق اور تشدید کا حامل ہوتا (اور کاشکے ایسا ہوتا) تو اس کی
شرر باری سے سنگ کا پتا پانی ہو جاتا۔ ایک دوسرے شعر میں ایک نیا خیال سر اُٹھاتا ہے۔
اور ہے یہ بھی جدت سے متصف:

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اس طرزِ ادا میں ایک طرح کی شوخی اور تیکھا پن ہے۔ تپشِ شعلۂ سوزاں' کا تعلق محبوب سے ہے (جسے پہلے مصرعے میں 'بدخو' قرار دیا ہے)۔ اور عجز اور نبضِ خس کا تعلق عاشق کی ذات سے ہے۔ یہاں بھی گویا دو شخصیتوں کو متعارف کرانے کے لیے متضاد صلاحیتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ایک عمومی مشاہدے سے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے، جس کا اظہار اتنے انوکھے اور اچانک طریقے سے کیا جانا قیاس میں نہیں آسکتا تھا:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھُواں اٹھتا ہے

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

گویا اپنی ناکامی اور نامرادی کی حالت کو شمع کشتہ قرار دیا کہ اس میں سے دھواں اٹھتا ہے، اور اسے شعلۂ عشق کا سیاہ پوش ہونا قرار دیا گیا۔ اسی کے مماثل اس سے پہلے ایک غزل میں وہ یہ بھی کہہ چکے تھے:

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

آگے چل کر ایک اور دلچسپ شعر سے سابقہ پڑتا ہے:

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے

سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

اس شعر میں ہمیں اپنے اس قیاس کے لیے ایک محکم بنیاد مل جاتی ہے جس کا شروع ہی میں ذکر کیا گیا تھا، یعنی غالب کے تحت الشعور میں زرتشتیوں کے اس عقیدے کا جاگزیں ہونا کہ ہر شے کی فطرت اور بیخ آتش پر رکھی گئی ہے۔ 'نالہائے شرربار' کا سرزد ہونا تو محبت کے شدید داخلی تجربے کا حتمی انعکاس ہے، اور اس سے وہ نتیجہ ہی نکالا جا سکتا ہے، جس کا ذکر شعر کے پہلے مصرعے میں کیا گیا تھا۔ اور اگر اسے وُسعت دی جائے تو عمومی واردات کے ضمن میں آتش کا پیکر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور رنگ کے لوازمات سے بھی خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا گیا ہے:

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا

کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یہاں 'ابرِ شفق آلودہ' کی سرخی اور گلستاں کے زیرِ آتش ہونے کے درمیان رنگ ہی کے توسط سے ایک رَبط قائم کیا گیا ہے، جو دلکش بھی ہے اور حلاوت آمیز بھی۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا 'کاغذِ آتش زدہ' کا پیکر اندرونی اضطراب اور پیچ و تاب کو نمایاں کرنے کے لیے بڑی ہنرمندی کے ساتھ لایا گیا ہے اور پھر اسے 'بالِ یک تپیدن' پر سے نسبت دے کر آئینۂ دِل باندھنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے،

برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

ایک اور سیاق و سباق میں 'صفحۂ دشت'، کو جو وحشت و درماندگی کے جذبے کی تحریک کرتا ہے، 'کاغذِ آتش زدہ' کے پیکر کے ذریعے متشکل کیا گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے نقشِ پا کی گرمئ رفتار کا:

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپ گرمئ رفتار ہنوز

یہاں 'یک قلم'، کی ترکیب، یہ کہنے کی ضرورت نہیں، مقدار کو ظاہر کرنے کے لیے لائی گئی ہے، اور یہ غالب کے شیوۂ گفتار کا ایک مانوس پہلو ہے اور لفظ 'ہنوز'، سے امتدادِ وقت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ نفسی برتاؤ کا یہ پہلو مسلسل ہے اور ختم ہونے والا نہیں۔ ایک غزل کے جس کی ردیف شمع ہے، شروع کے تین اشعار میں آتش اور شعلہ کے لوازمات بڑی خوبی کے ساتھ برتے گئے ہیں:

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانئ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانئ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانئ شمع!

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانئ شمع

اور پھر اس کے بعد:

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

پہلے شعر میں 'آتشِ گل' کو بالواسطہ طور پر آبِ زندگانی شمع قرار دیا گیا ہے' دوسرے میں فسانہ خوانیِ شمع، جو زندگی کے گذر جانے کا اشارہ ہے، شعلے سے لے تمام کرنے کا اشارہ دیتا ہے۔ تیسرے شعر میں شعلے کا لرزنا اور شمع کی ناتوانی ایک دوسرے سے لابدی طور پر منسلک ہیں۔ اور آخری شعر میں 'ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار' سے توجہ اس امر کی طرف منتقل ہوتی ہے کہ کاش کہ دل کی جراحتوں اور سوزش سے ایک ہی دفعہ نجات مل گئی ہوتی۔ محبت کے تجربے کے سلسلے میں آتش اور شعلے کی تپش اور سوزش اور ناتمامی ایک قطعی اور واضح پیکر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے غالب نے جگہ جگہ کام لیا ہے۔ اس طرح شرر کی برق رفتاری اور عدم استقامت زندگی کی بے اعتباری کا رمز بن جاتی ہے:

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

'یک نظر بیش نہیں' اور 'رقصِ شرر' کے مابین وجہِ اشتراک ناپائیداری کا تاثر ہے۔ ایک بہت ہی خوبصورت شعر میں دل میں سوزِ غم چھپانے کی مشکل کو شعلۂ آتش کے پرنیاں میں لپٹنے سے دشوار تر بتایا ہے:

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

یہاں پہلے مصرعے میں ایک ناممکن عمل کو مفروضۂ اولیٰ کے طور پر دیا گیا ہے' تاکہ مفروضۂ مابعد کو غلو کے ساتھ پیش کرنے کا جواز نکل سکے۔ یہ ایک طرح کی ملتبس منطق یعنی PSUEDO - ہے، جس کا عمل دخل غالب کی شاعری میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ ایک اور شعر میں اس طرح کی منطق کا انطباق طنز کے وسیلے سے اس طرح سامنے لایا گیا ہے:

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں   ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

'ہم نہیں جلتے' سے مراد دل کا جل کر خاکستر ہو جانا ہے۔ 'ذوقِ فنا' کی ناتمامی بظاہر ایک امید افزا محرک ہے۔ پہلے مصرعے میں 'جی جلے' سے اشارہ رشک کی طرف ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں 'ہم نہیں جلتے' سے مراد محبت کی تپش میں جلنا ہے۔ یہاں محبت کے سوز اور جلن کے لیے جو برابر دل کو مسل رہی ہے، ایک وجہ جواز پیدا کی گئی ہے۔ ایک مفرد شعر میں عاشق نے اپنے آپ کو 'آتش بجاں' یعنی مجسم آتش کہا ہے اور اپنے جذبۂ بے اختیار کی اس طرح نقش گری کی ہے:

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

اور محبوب کا امیج جو ایک چھلاوے کی طرح ہے، اس طرح ابھارا ہے:

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

اسی مفہوم کا داغ کا ایک شعر ہے:

مانندِ برق مثلِ ہوا، صورتِ نگاہ
اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے

داغ نے پہلے مصرعے میں تین تشبیہات استعمال کی ہیں۔ جو دلکش ہیں۔ لیکن دوسرے مصرعے میں ان کا [illegible] محسوس نہیں ہوتا۔ غالب کے ہاں پہلے مصرعے میں نیم استعاراتی انداز ہے، اور دوسرے مصرعے میں اس کا تاثر عدم یقین کے انتہائی درجے تک پہنچ گیا ہے۔ اور اس طرح غالب کا شعر، داغ پر بدیہی فوقیت رکھتا ہے۔ ایک اور شعر میں اپنے جذبۂ عشق کی حدت وحرارت سے کام لے کر کاروبار جہاں کی گرمی اور شگفتگی پر اس طرح دلالت کی ہے:

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

یہاں ایک سراسر موضوعی نقطۂ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ اور اسی طرح قلب و نظر کی تمازت و گرمی کو چراغاں کے پیکر سے منسلک کرنے کی مثال ایک اور شعر میں اسی طرح دی ہے:

پھر گرم نالہائے شرر بار ہے نفس　　مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

غالب کے ابتدائی دور کی شاعری یعنی نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں میں بھی آتش، شعلۂ شرار اور برق کے تلازمات اکثر جگہ نظر پڑتے ہیں۔ اور زبان اور اندازِ بیان کی غرابت کے باوجود مشاہدے اور تجربے کی اکائیوں تک قاری کی پہنچ کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ غرابت کے سلسلے میں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اسے محض بیدل کے زیرِ اثر فارسی زدگی کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا، بلکہ یہ وہ اجنبیت ہے جو مروّجہ زبان کے [illegible] اور نئے لسانیاتی سانچے میں ڈھالنے کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہے:

اسد کو پیچ وتابِ طبعِ برق آہنگ مسکن سے
حصارِ شعلۂ جوالہ میں عزلت گزیں پایا

یہاں 'پیچ وتابِ طبع' اور 'شعلۂ جوالہ' میں ایک مناسبت معنوی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ موخر الذکر کے حصار میں عزلت گزینی ہے۔ جو اوّل الذکر کا تقاضا ہے۔ محبوب کے رخسار کو شعلے سے تشبیہہ دینا غالب کے ہاں بھی اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اب یہ شعر دیکھیے:

شعلۂ رخسار تحیر سے تری رفتار کے
خارِ شمعِ آئینہ آتش میں جوہر بن گیا

یعنی شعلۂ رخ سے آئینے میں آنکھ فروزاں ہوگئی۔ آئینے میں جوہر کی دھاری کا موضوع بھی غالب کے ہاں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس دھاری کے ظاہر ہونے سے شبہ ہوا آگ شمع ہے اور خطِ جوہر شمع کا دھاگہ، جو نظروں کے سامنے نمایاں ہوگیا ہے۔ یہاں آگ، شعلہ اور شمع تینوں یکجا کر ملا دیے گئے ہیں اور انھیں وحدت بخشنے والا عنصر احساسِ حیرت ہے۔ پھول کا رنگ جو آتش کدے کی مانند ہے، بلبل اور بہار دونوں کو پھونک کر ختم کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لیے بلبل شاخِ گل پر بیٹھی بہار کے انجام پر غور و فکر میں مصروف نظر آتی ہے:

ہے بہاراں میں خزاں حاصل خیالِ عندلیب
رنگِ گل آتش کدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب

رنگِ گل کو آتش کدے سے تشبیہہ دینا غالب کو بہت مرغوب ہے اور ان کے شعری عمل کے

دوران اکثر روبرو رہتا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی ایک غزل میں غالب نے برق و شرر کے ضمن میں ایک انوکھا خیال پیش کیا ہے کہ یہ دونوں کچھ نہیں سوائے وحشت و ضبطِ تپیدن کے۔ اور آگ کی لپک اور اس کا التہاب دراصل خرامِ یار کی معجز نمائی ہے:

نہیں برق و شرر جز وحشت و ضبطِ تپیدن ہا
بلا گردانِ بے پروا خرامی ہائے یار آتش

اور معجز الذکر یعنی آگ خود اُتار چڑھاؤ کی پابند ہے۔ فرہاد کے تیشے کے جو شرارے نکلے ہیں وہ اس کے لیے پایانِ کار باعثِ عزت و احترام بن جائیں گے۔ جس طرح عاشق کی تمام عمر کی جدّوجہد اور بھاگ دوڑ اس کی قبر کے بیرونی حصّے کو چمک اور روشنی سے بھر دے گی:

سعیِ عاشق سے فروغ افزائے آبِ روئے کار
ہے شرارِ تیشہ بہرِ تربتِ فرہاد گُل

اور جس طرح خواہشِ آب یعنی پیاس سراب کی وجہ سے جنم لیتی ہے، بعینہٖ دل اگر سنگ کے مانند ہو جائے، تو پھر شرر کی ہستی بھی معدوم ٹھیرے گی کہ شرار سنگ ہی سے نکل سکتا ہے:

بے دلوں سے ہے تپش چوں خواہشِ آب از سراب
ہے شرر موہوم اگر رکھتا نہ ہووے سنگ دل

ایک شعر میں جو خالص موضوعی تجربے کا حاصل ہے، سوزِ عشق کی گرمی، جو آتشِ رخسار کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، پروانے کے شمع پر گر کر جلنے سے بے حد مشابہ ہے۔ گویا ایک خالص انفرادی تجربے کے لیے پروانے کے عمل سے تصدیق فراہم ہو جاتی ہے:

شامِ غم میں سوزِ عشقِ آتشِ رُخسار سے
پُر فشانِ سوختن ہیں صورتِ پروانہ ہم

شعلہ اور شرر ہی کے ضمن میں ایک بہت ہی اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے۔ یعنی تڑپ اور سوز کو سینے میں ضبط کر کے شرر کا بونا اور اس کے نتیجے کے طور پر شعلے کی کھیتی کاٹنا۔ جس میں کھٹکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں شعلوں کی یہ پیداوار ہماری سانسوں کی آمد و شد کو برطرف کر کے ہمیں زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور نہ کر دے:

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ درددن
کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم

ایک اور مشہور شعر میں بزمِ نشاط کی گرماگرمی کے سلسلے میں شمع خانۂ دل کے روشن ہونے کا انحصار حسینوں کی گرم جوشی اور التفاتِ فراواں پر رکھ کر آتش اور شعلے کے پیکروں کو اس طرح برتا ہے:

کہوں کیا گرم جوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی

مزید برآں ان پُر لطف اور زنگارنگ صحبتوں سے جو داغ دل پر پڑے ہیں وہ بہ رنگِ شعلہ دہک رہے ہیں۔ ان داغوں کی جلن کو اہلِ دانش و بنیش سے چھپانا بے معنی سا لگتا ہے:

بہ یادِ گرمیٔ صحبت، بہ رنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکے غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

آتش اور شعلہ ہی نہیں، بلکہ لالے کا داغ بھی، جو شعلے کا بنایا ہوا ہے، شمع سے مربوط ہے۔ چنانچہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لالہ جو بجھے ہوئے چراغ کا داغ ہے، محبوب کے جلوے کا اب بھی متمنی ہے چوں کہ داغ کو محبوب کا جلوہ نصیب نہیں ہوا، اس لیے گُل کے پردے میں دوبارہ ظاہر ہو کر وہ اس لذت کے حصول کا متلاشی ہے:

نامرادِ جلوہ ہر عالم میں حسرت گُل کرے
لالہ داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے

ایک شعر میں بڑی لطافت اور معنی آفرینی کے ساتھ شعلے اور چراغ کا معمول استعمال کر کے اپنے اور محبوب کے دوگونا تغافل کو اس طرح نمایاں کیا ہے:

آتش افروزی یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائی صد شہرِ چراغاں مجھ سے

یعنی تیرے ایک اشارے سے جو مثل شرارے کے ہے، میں سینکڑوں چراغ روشن کر دیتا ہوں۔ محبوب کی آنکھ کی چشمک میں چراغ کی روشنی چھپی ہوئی ہے، جو چراغاں کی آراستگی

میں کام آتی ہے۔ اسی طرح پتھر میں شرر کا ہونا اس ریشے کی نمود کرتا ہے۔ جس میں آگ بھری ہوئی ہے۔ اور یہ سوزِ محبت کے بے پایاں اثر کو ظاہر کرتا ہے:

اثر سوزِ محبت کا قیامت بے محابا ہے
کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے

ایک بہت ہی بلیغ اور پہلو دار شعر میں فرصتِ ہستی' یعنی عدم سے ہستی تک کی پرواز کو شرار کی چمک کے مماثل قرار دیا ہے اور اس میں اس کا آتش بہ بال ہونا دکھائی پڑتا ہے:

فرصت آئینہ و پرواز عدم تا ہستی
یک شرر بال دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے

یعنی ہستیٔ مختصر شرر کی چمک کی طرح ہے، اور باعثِ سرگرانی ہے۔ اور اس نے دل و دیدہ کے پروں میں چراغاں کا سماں پیدا کر رکھا ہے۔ اور اب فارسی غزلوں میں سے کچھ اشعار اسی ضمن میں دیکھیے:

سازو قدح و نغمہ و صہبا ہمہ آتش
یابی ز سمندرۂ بزمِ طربم را

زگرمی لغزشِ دل در اہتزاز آمد
شرارہ شہپرِ پروازگشت سنگش را

از نالہ خیزیِ دلِ سختش در آتشم
کایں سنگ پر شرر ز ہجومِ نگاہ کیست

نگہ ز شعلۂ حسنت چہ طرف بربندد
چنیں کہ طاقتِ ما را بناز سیماب ست

سرگرمی خیالِ تو از ناله باز داشت
دل پاره آتشیست که دودش نمانده است

فتیلهٔ رگِ جاں سربسر گداخته شد
ز پیچ و تاب نفسهاے آتشیں پیداست

نفس گداختگیهاے شوق را نازم
چه شمعها به سراپردهٔ بیانم سوخت

تا کیم دودِ شکایت ز بیاں برخیزد
بزن آتشی که شنیدن ز میاں برخیزد

نفس از بیم خویت رشتهٔ پیچیده را ماند
نگاه از تاب رویت موے آتش دیده را ماند

ازیں سوزِ طبیعی نگدازد نفسم را
صد شعله بیفشار و به مغز شررم ریز

دلی دارم که در هنگامهٔ شوق
سرشتش دوزخست و گوهر آتش

بسان موج میبالم به طوفاں
برنگ شعله میرقصم در آتش

ریزم از وصف رخت گل را شرر در پیرہن
آتش رشکم بجان نوبہار افتادہ ام

مدتی ضبطِ شرر کردم بپاس غم ولے
خوں چکیدن دارد اکنوں از رگ خارا ے من

بردہ در انجمن شعلہ رخانم غالب
ذوقِ پروانہ ای بر روی چراغاں زدہ ای

درو دیوار را زر گرفت آہ شرر بارم
شبِ آتش نوایاں آفتاب انداست پنداری

قماش ہستی من یکسر آتشست آتش
مرا چو شعلہ بود پشت وروی کار یکی

آتش، شعلہ، شرر اور برق کے علائم کا تواتر کے ساتھ استعمال اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ غالب کو ان سے خصوصی رغبت ہے۔ اور یہ دوسرے مرکزی علائم جیسے آشیاں، گل، آئینہ، پرِطاؤس، گلشن، موئے، سیماب وغیرہ سے بھی ہم رشتہ ہیں۔ یہ سب مِل جُل کر ایک ایسی شعری فضا کی تخلیق کرتے ہیں جو دلکش بھی ہے اور ان مفاہیم کی ترسیل میں بھی معاون ہوتی ہے جو اکثر و بیشتر ان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ میں ان سب علائم کا استعمال کسی قدر گنجلک انداز میں ملتا ہے۔ وہاں فارسی تراکیب اور صفات کے جوڑے ایسے گتھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کی تفہیم کے لیے انھیں DECONSTRUCT کرنے کا کام خاصا دشوار ملتا ہے۔ متداول دیوانِ اُردو اور فارسی غزلیات میں ایک نوع کی سہولتِ اظہار نظر آتی ہے۔ لیکن اُردو کلام میں بظاہر لسانیاتی

سادگی جسے ایک طرح کی شفافیت یعنی T... ...T کہنا چاہیئے۔ معنی ومفہوم کی طرفگی اور پیچیدگی کی نفی نہیں کرتی۔ غالب کے ہاں رنگوں کی فراوانی اور بہتات بھی نظر آتی ہے، اور یہ رنگ گہرے اور خیرہ کن ہیں۔ ان سب کی یک جائی ایک ایسا CONTRAST فراہم کرتی ہے، جس میں غالب کا تخیل اپنی پرواز اور نادرہ کاری کی وجہ سے جاذب نظر بن جاتا ہے۔ محبوب کی کردار نگاری کے نمونے شعرائے متقدمین کے ہاں بھی ملتے ہیں اور رنگوں اور خوشبوؤں کے تانے بانے بھی۔ لیکن اتنے مرتکز انداز میں نہیں۔ غالب کے ہاں اس سے ایک طرح کا فکری عمل بھی وابستہ ہے۔ قدیم ایرانی روایت میں، جس سے شاید غالب اثر پذیر ہوئے ہوں، آتش اور اس کے مضمرات کے ضمن میں نہ صرف اسے آہورا مزدا کی ایک مبارک نشانی مانا گیا ہے بلکہ آثار FLAMING FIRE OF THOUGHT بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ آگ تجدید حیات کی جسے FRASHOKERIT کہا گیا ہے، مدت تک جلتی رہتی ہے۔ غالب کے ہاں حسی تلازمات فکر و تامل کی کٹھالی یعنی RECEPTACLE سے ہو کر گذرتے ہیں۔ اس کا کچھ دور کا تعلق علاوہ اپنی متفکرانہ طبیعت کے ایرانی روایت کے سلسلے سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

اُردو میں مکتوب نگاری کا فن
اور
انشائے بہارِ بے خزاں

غلام امام شہید کی اُردو ادبیات یا انشائی نگارشات کا یہ مطبوعہ نسخہ جو اس وقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے وہ ۱۵×۲۴ سینٹی میٹر اور جدولِ نگارش کا سائز ۱۲×۲۲ [سینٹی میٹر] ہے۔ جدول کشی از اوّل تا آخر دو خطین ہے۔ مسطر شروع سے اتمام پر ۲۱ سطری ہے۔ صرف صفحہ ۲ تک بیاض پیشانی کے، جدولی خطوط کے باعث سطروں کی تعداد ۱۵ ہے۔ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' جدولوں کے مابین آئی۔ سرورق اور آخری صفحہ طباعتی تزئین کاری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ ہر صفحہ پر نشانات شمار موجود ہیں۔ جہاں کوئی خاص بحث زیب دہ ہے وہاں نشان دہی کے لیے صفحہ کے بالائی حصہ اور (اس خاص بحث سے متعلق) اشاراتی نگارشے موجود ہیں۔ خط، نستعلیق ہے اور انداز خوش نویسانہ۔ جن الفاظ یا عنوانات کو نمایاں بخشنا مقصود ہے انھیں قدرے جلی خط میں لکھا گیا ہے۔

اشعار بیشتر نثری اسلوب میں تحریر کیے گئے ہیں

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس کا موضوع تحریر و نگارش کا وہ اسلوب یا اسالیب ہیں جو فنِ دبیری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً رقعہ، شُشقہ، ہبہ نامہ، راضی نامہ،

دستاویز، مختصر رسید، تقسیم نامہ، فیصل نامہ، صلح نامہ، قبض الوصول وغیرہ۔ لیکن اس نوع کی تحریروں اور نگارشات کے نمونوں کے ماسوا اس میں زیادہ تر اہمیت تحریریں فن مکتوب نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔ بنیادی طور پر اسی نوعیت کی ایک انشا آموز کتاب ہے جیسے مرزا غالب اپنے برادر نسبتی مرزا علی بخش بہادر کے لیے لکھنا چاہتے تھے اور اس انشائے بہار بے خزاں سے بھی کچھ پہلے اس طرف توجہ فرما ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اضافے اس کے بہت بعد تک ہوتے رہے۔ اضافوں کا یہ سلسلہ انشائے بہار بے خزاں سے بھی اسی طرح وابستہ ہے۔

یہ کتاب، جس کے مشتملات پر تفصیلی گفتگو آئندہ سطور میں آئے گی آنریبل مسٹر جیمس طامسن بہادر لفٹیننٹ گورنر صوبہ آگرہ کی فرمایش پر ترتیب دی گئی۔ جیمس طامسن خود غالب کے ممدوحین میں سے بھی ہے اور غالب کی فارسی زبان میں دو عرض داشتیں بھی اس کے نام ملتی ہیں جو بہ صورت مکتوب تحریر ہوئی ہیں۔ جیمس طامسن ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۰ء کے درمیان آگرہ کی گورنری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا۔ یہ زمانہ اس انشائے بہار بے خزاں کی اساسی تسوید و تالیف کا بھی ہونا چاہیے۔

غلام امام شہید نے لفٹیننٹ گورنر بہادر کی فرمایش اور پھر اس کی تعمیل اور تکمیل کے بارے میں یہ لکھا ہے:

لفٹیننٹ گورنر بہادر کی طرف سے یہ حکم پہنچا کہ ایک انشائے مختصر کہ لڑکے اس کو سمجھ سکیں، اور اس سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم پاویں طیار ہو... ... ہر چند ... جاننے والے جانتے رہیں کہ اگر کسی نظم، خواہ نثر فارسی سے متعلق یہ بات ہو تو وہ زیادہ تر مناسب حال اس فقیر کے تھی۔

بہر حال تعمیل ارشاد بھی ضروری تھی اور یہی جذبہ یا خیال اس کی تالیف کا باعث ہوا۔ صاحب تحریر نے آگے چل کر اس کتاب کے مشتملات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ . . . . اور یہی اوراق لکھ کر اس کے چار باب مقرر کیے اور "بہار بے خزاں" اس کا نام رکھا۔ پہلا باب نظم اور اس کے اقسام کے بیان میں ہے۔ نظم کی تعریف کے ذیل میں صرف اتنا لکھا ہے

کہ" اوس کلام کو کہتے ہیں جو وزن اور قافیہ رکھتا ہو" اور مصرع کے لیے کہا ہے کہ وہ صرف ایک فقرۂ موزوں ہوتا ہے اور مثال میں اس مصرع کو پیش کیا ہے کہ

دل تری زلف میں اسیر ہوا

اقسام نظم میں، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، فرد، مثنوی ترجیع بند، ترکیب بند، مسمط و مستزاد وغیرہ کو رکھا ہے۔ اس میں مرثیہ، نوحہ اور واسوخت جیسی شعری اصناف کو بھی شامل کیجیے۔ غزل کی روایتی تعریف کو ان الفاظ میں قلم بند کیا گیا ہے۔

"غزل، لغت میں عورتوں سے بات کرنے اور عورتوں سے بات کرنے اور عورتوں کی باتوں اور عورتوں کی عشق کی باتوں کو کہتے ہیں۔ اور غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عشق اور محبت اور معشوقوں کے حسن و جمال اور جدائی کے قلق اور رنج اور وصل کی خوشی کا احوال ہو۔"

غزل کی یہ تعریف اور شاعرانہ زاویۂ نگاہ سے اس کی توضیح ایک قدیمانہ روایتی انداز سے آگے نہیں بڑھتی اور غزل کی راہ ارتقا کے مراحل کی کوئی نشان دہی اس سے نہیں ہوتی۔ مولوی غلام امام شہید کے یہاں روایت سے وفاداری کا یہ رجحان دوسری شعری اصناف کی تعریفات میں بھی اسی انداز سے ملتا ہے۔ مطلع حسن مطلع اور قصیدہ کی تعریف میں قصیدۂ مجدّد کی بھی مثال پیش کی گئی ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہوتا ہے جس میں تشبیب یا نسیب کو جزو قصیدہ کے طور پر شامل نہیں کیا جاتا۔ واسوخت کے لغوی معنی دیتے ہوئے لکھا ہے۔ حقیقت میں واسوخت اقسام شعر میں کوئی علیحدہ قسم نہیں ہے۔

-

تاریخ کے ذیل میں حروف ابجد کو املائی طور پر ان کے صوتی آہنگ کا پابند رکھا ہے۔ الف، بے، جیم، ہے، واو، زے، حے، طو اور یے وغیرہ۔ اور ان سے وابستہ اعداد کی وضاحت کی ہے۔

اصنافِ شعر سے متعلق تعریفات کا یہ سلسلہ دیوان، کلیات، نیز حمد و ثنا اور نعت و منقبت کی ادبی تعریفات پر تمام ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال ذہن کی سطح پر

اُبھرتا ہے کہ آخر انشا پردازی یا فن دبیری سے متعلق ان تحریروں میں پہلے باب کے تحت انواع شعری پر اس تعارفی یا لغت کی رُو سے تعریفی حصّہ کی ضرورت ہی کیا تھی، شاید اس کا جواب یا سبب جواز یہ ہو سکتا ہے کہ شعری اصناف نثری نگارشات میں اور مختص طور پر انشائی و مکتوباتی ادب میں موضوعِ گفتگو بنتی رہیں۔ غالب کے بہت سے فارسی خطوط میں قوسِ قزح کی سی اُن رنگا رنگ شعری روایتوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلی فصل کے مقابلہ میں دوسری فصل بہت مختصر ہے یعنی صرف تیرہ سطروں میں اس کے مشتملات کا بیان اتمام پزیر ہو جاتا ہے۔ اس میں نثر مرجز نثر مسجع اور نثر عاری کی تعریفات کو شامل کیا گیا ہے اور ان کی تعریفات پیش کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"نثر مرجز اس نثر کو کہتے ہیں کہ جس کا ہر فقرہ موزوں ہو یعنی شعر کے کسی وزن پر پایا جائے اور قافیہ نہ ہو یہ قسم بہت کم پائی جاتی ہے مثال اس کی اپنے ہاتھوں سے مجھے قتل کرے میں نے خون اپنا کر دیا ہے معاف ۔ آیئے بیٹھیے کرم کیجیے ۔ میرے صاحب یہ آپ کا گھر ہے۔

مُسجع اس کے خلاف ہے یعنی اس میں فقرات قافیہ دار ہوں اور موزوں نہ ہوں اور وہ فقرہ کبھی تو رنگین ہوتا ہے اور کبھی صاف صاف ۔ فقرۂ رنگین کی مثال، سبزہ پر شبنم کے قطرے اس طرح نمودار جس طرح زمرّد کے تختی پر ہیرے جڑے ہوں، اور ہر شاخ پر بیلے چمیلی کی کلیوں سے وہ بہار جیسے سبز پری کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوں۔

فقرۂ صاف کی مثال، کل میں آپ کے گھر آؤں گا اور کھانا وہیں کھاؤں گا۔ حضرت جو فرمائیں گے ہم اس کو بجا لائیں گے۔

عاری ان دونوں سے عاری ہے یعنی نہ اُس میں وزن ہو نہ قافیہ اور اس کو روزمرّہ بھی کہتے ہیں۔

مثال اس کی غلام امام شہید نے ایک سادہ سے رُقعے کی شکل میں پیش کی ہے ۔

دوسرا باب مکتوب نگاری اور تحریر و انشا کے نقطۂ نظر سے اس کتاب کا مرکزی اور مقصدی حصّہ ہے، لکھا گیا ہے۔ خط و کتابت کے دستورات میں اور اس میں تین

فصلیں ہیں۔ پہلی فصل اُردو کے بیان میں (یہ بیان کُل اٹھ سطروں کو محیط ہے)۔ اس میں فارسی زبان وادب کے اُردو زبان پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے صاحبِ کتاب نے لکھا ہے:

"بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں ہو گیا اور داستان اور کہانیاں اُردو میں عجیب وغریب لکھی گئیں اور لکھی جاتی ہیں لیکن خط و کتابت کا دستور اُردو زبان میں اب تک جاری نہیں ہوا۔"

فاضل مصنف کے خیال سے "جس طرح نظم اور نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی اسی طرح خط و کتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضرور ہوگا"، اور اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:

"فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں ناچار اُردو میں بھی اسی کا تابع ہونا پڑے ..... جس طرح فارسی میں بڑے چھوٹے اور برابر والے کو خط لکھتے ہیں اسی طرح اُردو میں بھی خواہ مخواہ لکھنا ہوگا اب سوچنے کی بات ہے کہ فارسی میں جو الفاظ بڑے چھوٹے یا ہم سر کے واسطے مقرر ہیں کہ اس کو "القاب" کہتے ہیں اور اس کے بعد جو الفاظ لکھے جاتے ہیں اور اُس کو آداب کہتے ہیں ..... اس کا ترجمہ کر کے کوئی دوسرا قاعدہ ٹھیرایا جائے ....."

صاحبِ نگارش کے خیال میں یہاں تقلید ایک گونہ ناگزیر صورت ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ القاب و آداب کی روایت اور قاعدہ کو سرتاسر اگرنہ بھی بدلا جاسکے، تو الفاظ میں تبدیلی تو کی ہی جا سکتی ہے اور اسی زمانے میں ایسا ہوا بھی ہے۔ غالب کے اُردو اور فارسی خطوط میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ناگزیریت کے علی الرغم روایت شکنی کی طرف ذہن اس زمانے میں مائل ہو چکا تھا، ہاں اس کی وافر مثالیں نہیں ملتیں۔

اس وقت جب کہ اُردو میں صحافت نگاری اور کتب خانوں کے رواج کے ساتھ نئے انداز اور اسلوبِ گذارش کے تقاضے خاموش روی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اُردو میں خطوط نگاری کے اُصول وضوابط کی طرف توجہ دہی کی یہ سعیِ مشکور ایک عہد آفریں اقدام اور

روایت سازی کے اعتبار سے ایک بے حد اہم بات ہے۔

القاب و آداب کے سلسلہ میں ایک نوع کی ضابطہ بندی اور تعارفی حدود سازی کے ماسوا، آگے بڑھ کر غلام امام شہید نے لکھا ہے:

"خط کو خط ہی لکھیں گے اور بڑے کے پاس سے جو خط آوے تو اس کو عنایت نامہ کہتے ہیں اور بادشاہ کے حضور سے آوے تو فرمان، امیر و وزیر کی نوشت کو شقہ اور پروانہ بولتے ہیں اور چھوٹا جو خط لکھے تو عریضہ اور عرضی اور لکھنے والا خط کا کہ اس کو کاتب کہتے ہیں، اپنے تئیں کم ترین اور فدوی اور فقیر اور خادم اور نیاز مند اور مخلص۔ اور مکتوب الیہ یعنی جس کے نام خط ہو اس کو جناب اور حضور وغیرہ لکھتے ہیں۔"

یہ القاب و آداب اور لفظیات آغاز و اختتام کی یہ نشان دہی دستور سازی کا عمل ہے اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی دستور حرفِ آخر نہیں ہوتا۔

یہ پہلی فصل جس کی بعض نگارشات اور ترجیحات و تعریفات پر سطور بالا میں گفتگو آئی ہے۔ تمہید و ابتدائیہ تھی۔ دوسری مفصل کے لیے جس کے ساتھ یہ وضاحتی کلمہ بھی موجود ہے "خط لکھنے کی تعلیم میں" اس ضمن میں کہ تعلیم دہی اور اصول تربیت کی آموزش پیش نظر ہے۔ غلام امام شہید نے لکھا ہے۔ اس فصل کے تحت جو پہلی تحریری ہدایت سامنے آئی ہے وہ مکتوب الیہ کی مرتبہ شناسی سے متعلق ہے اور اس کے لیے لکھا گیا ہے۔

"خط لکھنے والے کو چاہیے کہ جس کے نام خط لکھنا ہے اس کے مرتبہ کو سوچ لے کہ وہ بڑا ہے یا چھوٹا یا برابر ہے اور یہ بڑائی یا چھوٹائی اور برابری کچھ سنّ و سال پر موقوف نہیں بلکہ کبھی حال اور کبھی کمال پر خیال کی جاتی ہے ... میری دانست میں بڑائی اور چھوٹائی سن و سال کی رو سے صرف قرابت میں دیکھنے کے قابل ہے نہ غیروں میں۔"

مصنف نے اس موقع پر "مقدمۂ القاب" کی اصلاح بھی استعمال کی ہے اور اس کے تحت اُن الفاظ کو لیا ہے جو خط کی تحریر کے وقت، مکتوب الیہ کے مرتبہ کو ذہن میں رکھ کر آغاز نگارش میں سپردِ قلم کیے جاتے ہیں۔ پہلی قسم میں، قرابت یا عزیز داری کے رشتہ کو

نظر میں رکھتے ہوئے چچا صاحب، ماموں صاحب، یا بھائی صاحب، یا بھائی صاحبہ، ہمشیرہ صاحبہ جیسے القاب نگارش، دیے گئے ہیں۔ دوسری قسم میں خطاب یا اسلے عزت پیش نظر ہیں۔ راجہ صاحب، نواب صاحب اور اسی قبیل کے مرکب الفاظ تحریر کیے گئے ہیں۔ مولوی صاحب، منشی صاحب، یا ... ... حافظ صاحب جیسے ترکیبی اسما اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ چوتھی قسم میں عہدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ جیسے قاضی صاحب، مفتی صاحب، بخشی صاحب اور دیوان صاحب۔ پانچویں قسم میں نسلی امتیازات کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جیسے میر صاحب، چودھری صاحب، مرزا صاحب، شیخ صاحب۔

بعد ازاں عمومیت کے ساتھ احترام کے رشتے یا برابری کے تعلق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ان میں مردوں اور عورتوں کے لیے زبان قلم پر آنے والے کلمات القاب لکھے گئے ہیں۔ بعض ایسے کلمات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

نواب صاحب والامراتب، عالی مناقب ــ یا خان صاحب معدن فیض و احسان، یا لالہ صاحب، بسیار مہربان دوستان۔ قبلہ و کعبہ، اُمیدگاہ فدویان۔ پیر و مرشد برحق و خداوند نعمت مطلق اُمیدگاہ فدویان۔ یا قبلۂ کونین و کعبۂ دارین۔ قبلۂ عالم و عالمیاں۔

اس بحث کے خاتمے سے پہلے۔ مقدمۂ القاب کے ضمن میں "القاب" کے عنوان سے بعض ایسے القاب دیے گئے جو اس دور کی مکتوب نگاری اور مؤدب و مہذب آداب گفتگو میں، وہ بزبان قلم ہو یا بزبان متکلم عام طور پر ملتے ہیں۔ مثلاً مولوی صاحب مشفق مہربان کرم فرمائے مخلصاں، راجہ صاحب، عالی شان قدردانِ نیازمنداں۔ یا زنان و عورات کے سلسلہ میں خانم صاحبہ، مشفقہ محترمہ، یا بیگم صاحبہ، شفیقہ محترمہ، یا "خاتون مخدرات زمان و زمانیان"، "عصمت پناہ و عفت دست گاہ" اب ظاہر ہے کہ یہ وہ القاب ہیں جو ہم سروں اور ہم چشموں کے لیے بھی کام آتے ہیں اور بڑے رُتبہ والے اشخاص کے لیے بھی، اب کوئی چھوٹا ہے تو عزیز از جان، نورالابصار، نور چشمی، قرۃ العین وغیرہ۔ یہ ایک دور تہذیب، اس کے انداز رتبہ شناسی و قدر افزائی کا رویہ ہے جس

میں بزرگ داشت کو ایک اہم تہذیبی قدر کی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اقدار شناسی اور آدابِ گفتگو میں اس کی پاس داری، خردوں کے معاملہ میں بھی اسی طرح پیشِ نہاد خاطر رہتی تھی۔

وہ بھی وقت آیا کہ مسائل و معاملات بدلے، اپنے، بیگانے، اعزا و اقارب، احباب و انصار کے بارے میں خیال و حال کے پیمانے تغیرِ زمانہ کے ساتھ بدل گئے تو اس نوع کی باتیں تکلفات بارد میں شمار ہونے لگیں۔ دو کلموں پر مشتمل القاب میں روایت پسندی اور قدامت پسندی کی خو بُو کا احساس ہونے لگا۔ غالب نے تو اس طرف اپنے اُردو ناموں اور کہیں کہیں اس کی طرف فارسی مکتوبات میں اشارے کیے ہیں مگر القاب و آداب کو بیشتر ادبی حسن کے ساتھ برتا بھی ہے۔ تخلیقی فنون میں حد بندیاں بالکل اضافی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ وہ پتھر کی لکیریں نہیں ہوتیں۔

زیادہ تر اہمیت ایک روایت کے حسن و قبح کی نہیں ایک تشکیلی یا تخلیقی رویے کی خوبی یا نامرغوب رویے کی ہے۔

سادہ عبارتیں یا پھر وہ نثری نمونے جن میں انشا پردازی کے رشتے سے آراستگی و حسن آفرینی یا پھر ادبی سطح پر ادا نمائی کی شعوری کوشش کی جاتی ہے وہ تناسب، توازن اور تناظر کی کمی یا عدم موجودگی کی وجہ سے ناموزوں معلوم ہوتی ہے اس میں سامع یا قرأت کنندہ کی طرف سے نارسائی یا نفسیاتی طور پر جذبۂ ناسپاسی کو بھی دخل ہو سکتا ہے جس میں عیارگیری کے وقت زمانہ کی تصویر گذراں پر نظر داری کے تقاضے پیشِ نظر نہیں ہوتے۔

صاحبِ کتاب نے چوں کہ اپنی اس یادگار زمانہ تصنیف کو مکتوب نگاری کی مبادیات اور اس مقصد کے تحت عبارت و اشارات کے گوناگوں نمونوں سے سجایا ہے یا دوسرے لفظوں میں کیا۔ اس کی بہت نمایاں صورت وہ علمی یا ادبی مصطلحات بھی ہیں جن کے وسیلے سے مکتوب کے مختص اجزا کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان کے ذیل میں "ادعیہ" یا پھر کلمات دعائیہ بھی آتے ہیں" آداب" بھی اور تحیت بھی۔ اشتیاقیہ ملاقاتیہ اور صفت ملاقاتیہ نیز اظہاریہ بھی۔

"آداب" کی تعریف کرتے ہوئے غلام امام شہید نے لکھا ہے۔ آداب اس فقرے کا نام ہے جو بعد القاب کے لکھا جاتا ہے۔ اور جس طرح مقدمۂ القاب، اور ادعیہ سب مل کر ایک القاب کہلاتا ہے اسی طرح تحیت، اور اشتیاقیہ، ملاقاتیہ نفیف ملاقاتیہ اور اظہاریہ سب کو ملاکر آداب کہتے ہیں۔

تحیت کے ذیل میں لکھا ہے ہم سر کو جو سلام اور نیاز اور بڑے کو جو بندگی اور کورنش اور تسلیمات اور چھوٹے کو دعائے درازی عمر اور مثل اس کے جو کچھ لکھتے ہیں اس کو تحیت کہتے ہیں۔

اظہاریہ کی تعریف میں مطلب لکھنے یا خبر دہی کو شامل کیا ہے ـــــ

خطوں کو بھی صاحب تحریر نے نام دینے کی سعی کی ہے ـــــ

مثلاً الطاف نامہ، محبت نامہ، نوازش نامہ، سرفراز نامہ یا فرمان واجب الاذعان اور اپنے خط کو عریضہ، رقیمہ یا رقیمۂ نیاز جیسے صفاتی کلمات سے یاد کیا ہے اس میں "خط کی رسید" کے ماسوا، ایک اور اصطلاح "ادراکیہ" بھی استعمال کی ہے۔

کاتب کے نام، مکتوب الیہ کے نام، دوسرے کسی شخص کی صفت، کسی شے کا بھیجنا، طلب کرنا، یا آنے پر شکریہ ادا کرنا۔ مکتوب الیہ کے آنے جانے کے احوال، یہ امور خط کے موضوع سے متعلق ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک خط لکھنے والے کو ان سب حدود و قیود کا علم ہو، کیا یہ ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھتے وقت تو ایک مکتوب نگار اپنی بات اپنے طور پر ہی کہے گا، لیکن کسی نگارش نامہ کی نوعیت تفہیمی یا تنقیدی زاویۂ نگاہ سے گفتگو کرتے وقت ان اجزا و عناصر سے کلیتاً صرفِ نظر بھی ممکن نہیں، مختلف علوم وفنون یا ادبی نگارشات کے مختلف گوشوں پر جہاں نظرداری ضروری ہے وہاں ان کو علمی، فنی اور ادبی اصطلاحات قایم کر کے ان کے وسیلہ سے روشناس کرنا کچھ اور بھی زیادہ مفید طلب ہو سکتا ہے۔ خط کے آخری حصہ کو صاحب کتاب نے "خاتمہ" کے اصطلاحی لفظ سے یاد کیا ہے اور ان کلمات کو پیش کیا ہے جو اس موقع پر آتے ہیں۔

مختلف الحیثیت مخاطبین مکتوب کے لیے خطوط کے متنوع نمونے درج کیے ہیں۔ یہ اپنے طرز عبارت واشارت میں گوناگوں کیفیات و مطالب کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے طور پر نقشے اور خاکے بھی بنائے ہیں۔ اور ہر صورتِ حال کو مثال سے واضح کیا ہے۔ خطوط کے نشانات شمار لفظوں میں دیے گئے ہیں اور فرق مراتب کی نشان دہی نسبتاً جلی خط میں کی گئی۔ چھٹے نمبر پر آنے والے مکتوب کو "چھٹواں خط" کہا گیا ہے
تیسرا باب خطوط اور رقعات پر مشتمل ہے یہ ان ضوابط کو نظر میں رکھتے ہوئے تحریر کیے گئے ہیں۔ خطوں کی زبان سادہ سلیس پُر لطف اور با مقصد ہے۔ یہ خط براہِ راست کسی مکتوب الیہ کو لکھے گئے ہوں ممکن تو یہ بھی ہے لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ نموناً انشا کیے گئے لیکن بیشتر ان کو پڑھتے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ واقعتاً لکھے ہوئے خط نہیں ہیں اور یہ اُردو خطوط کی وہ مثالیں ہیں جو ماڈل کے طور پر تلاشی یا تراشی گئی ہیں اور اس لحاظ سے بھی انھیں مکتوب نگاری کی تکنیکی یا فنی خصوصیات کو واضح کرنے کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔

غلام امام شہید اپنے اس ادبی دائرے میں ایک بڑے باکمال اور "صاحب حال" شخص تھے جنھوں نے زمانے کی بدلتی ہوئی روش کو نہ صرف یہ کہ محسوس کر لیا تھا اور درپیش یا آیندہ پیش آنے والی اس تاریخی و معاشرتی ضرورت اور اس کے تقاضوں کو سمجھ لیا تھا اور زمانے کی اس تقاضہ سنجی یا اس کے خاموش چیلنج کے جواب میں اپنی عصری حسیت سے کام لے کر ان تحریروں کو مرتب کیا اور بالخصوص متنوع مکتوبات اور رنگا رنگ خطوط کا ایک تاریخ ساز مرقع پیش کیا۔

یہ تحریرات و انشائیات اگر اپنی سادہ صورت میں سامنے آتیں تو کہا جا سکتا تھا، غلام امام شہید نے خطوط میں مختلف کو پیش نظر رکھ کر اپنی اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ وہ ان کی انشا پردازانہ ہنرمندیوں کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔ اسے ان مکتوباتی تحریروں کے مقابلہ میں رکھنا مناسب نہ ہوگا جو مکتوبات سے ہم رشتہ ادب میں تخلیقی نگارشات کی بہترین مثالوں کے ذیل میں آتی ہیں اور غالب کے یہاں

نامہ ہائے فارسی اور اُردو خطوط میں اس کی بہت عمدہ امثلہ بہ ادنا توجہ مل جاتی ہیں۔

مگر اس سے گذر کر فارسی اور اُردو انشائیات میں جو کچھ نیم تخلیقی اور نیم تشکیلی یا پھر فنکارانہ وصناعانہ رویّہ ملتا ہے اس کے رنگ وہیز رنگ کو ہم ان کے لیسے خطوط میں دیکھ سکتے ہیں۔ جن میں صنایع بدایع کی یہ صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔
ایک خط میں ملبوسات، زیورات اور رنگوں وغیرہ کے نام گنائے ہیں۔ اس خط کو ہم صرف ایک خط نہیں کہہ سکتے اس میں مضمون نویسی ماحول کی تصویر کشی، واقعہ طرازی اور ہم رنگ و ہم سنگ اشیا کی تلازمہ نگاری کی ایک مثال کے طور پر بھی سامنے رکھ سکتے ہیں۔
جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس موقع پر ہر طرح کے نگارشی اجزا کی مثالیں دی جائیں لیکن بنگاہِ اختصار ان کو رنگوں کی رنگا رنگی تک محدود رکھا جاتا ہے۔

گلنار، گلابی، بسنتی، دھانی، سبز کاہی، ماشی، زنگاری، فلفلی، قرنفلی، کشمشی، عنابی، عباسی، کپاسی، سیپی، دسوسنی، کاسنی، کافوری، صندلی، اگری، شربتی، نارنجی، سنہری، سردئی، آبی، کاکریزی، سُرمئی، پیازی، پیشوازی۔

ان میں سے بہت سے رنگوں کے نام اب سے نصف صدی یا پھر ایک ثلث صدی پہلے تک سُننے کو مل جاتے تھے۔

نقد قاطع برہان

مع ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت : ساٹھ روپے

—— ملنے کا پتا ——

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر نذیر احمد

غالب کے شعر میں ایک دلچسپ تلمیح

آم کی تعریف میں غالب کی ایک چھوٹی مثنوی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینہ راز

اس مثنوی کے دو شعر یہ ہیں:

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس

آم کو دیکھتا اگر اِک بار
پھینک دیتا طلائے زر افشار

(دیوانِ غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹۶-۱۹۸)

ان دونوں ابیات میں خسرو پرویز کے ترنج زر افشار کی تلمیح نظم ہوئی ہے۔ یہ تلمیح اُردو اور فارسی شاعروں کے یہاں استعمال ہوئی لیکن کثرت سے نہیں، پہلی بیت میں "ترنج زر" کی تلمیح ہے اس میں خسرو پرویز کے ترنج کی طرف اشارہ ہے جو زرِ دست افشار یا طلائے

دست افشار سے بنا تھا، اس لیے ترنجِ زر اور طلاے دست افشار دونوں سے صرف ایک تلمیح مراد ہے، دو نہیں!

ترنج ایک پھل ہے جو گہرے زرد رنگ کا ہوتا ہے، ترنج زر بھی رنگ کے اعتبار سے گہرا پیلا ہوگا، آم جب پک جاتا ہے تو اکثر گہرا زرد ہوتا ہے، اس لحاظ سے غالبؔ نے آم کو ترنج زر سے مقابلہ کیا ہے اور چوں کہ ترنج زر خوشبو سے عاری ہوتا ہے اس لیے غالب نے آم کو اس سے بڑھ کر قرار دیا ہے۔

خسرو پرویز ایران کے ساسانیؔ خاندان (۲۲۶ء تا ۶۵۲ء) کا جلیل القدر فرمانروا گذرا ہے، جس نے ۵۹۰ء تا ۶۲۸ء حکومت کی ہے، وہ ہرمز چہارم کا بیٹا اور نوشیرواںؔ کا پوتا تھا۔ باپ کے قتل کے بعد ۵۹۰ء میں تخت نشین ہوا، کچھ دنوں بعد بہرام چوبین نے اس کو نکال دیا تو وہ قیصر روم سے مدد کا طالب ہوا، چنانچہ قیصر کی مدد سے بہرام کو شکست دی، ۶۱۲ء میں روم پر حملہ کیا، اور ۶۱۵ء تک اس کی طاقت بامِ عروج تک پہنچ چکی تھی۔ ۶۲۳ء میں ہرقل قیصر نے ایشیاے کوچک کو فتح کر ڈالا، ۶۲۸ء میں دستجرد کے شاہی قصر پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا، اور پھر مدائن پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا، اس خبر سے خسرو کو بڑی وحشت ہوئی اور وہ دارالحکومت چھوڑ کر بھاگ گیا، مگر جلد ہی پکڑ لیا گیا اور قتل کر دیا گیا، خسرو پرویز کے جاہ و جلال، اس کے خزائن اور اس کی عشقیہ داستان کی شہرت عام ہو چکی تھی، شیریں اس کی معشوقہ تھی، خسرو شیریں اور شیریں فرہاد کی داستان مشرق ادب کا دلچسپ موضوع ہے، خسرو پرویز کی شہنشاہیت اس کی بے پناہ دولت، اس کی عیش و عشرت کی زندگی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن سے اُردو اور فارسی ادب کا دامن مالا مال ہے، اس سلسلے کی چند مثالیں درج کی جارہی ہیں:

سنجیدنی ہے ایک طرف رنج کوہکن
خواب گران خسرو پرویز اک طرف

(کلیاتِ غالب ص ۴۹)

تکلیف برطرف فرہاد اور اتنی سبکدستی
خیال آساں تھا لیکن خواب خسرو نے گرانی کی

(کلیات غالب ص ۷۷)

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
بیستوں خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

(ایضاً ص ۸۵)

عشق و مزدوری عشرت کدہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

(ص ۱۸۶)

اقبال نے خسرو پرویز کے بجائے پرویز کا استعمال نئے انداز سے کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اس مرد خود آگاہ خدا دوست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

(کلیات ص ۲۵۴)

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

(کلیات ص ۲۹۴)

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

(کلیات ص ۳۱۶)

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز

(ص ۳۲۱)

گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنت پرویز

(ص ۲۲۰)

تیشے کی کوئی گردش تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز جگر تشنہ ہے فرہاد

(ص ۲۵۱)

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

(ص ۲۶۲)

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(۲۴۶)

اقبال نے اپنی فارسی شاعری میں بھی پرویز اور خسرو پرویز کو بطور علامت کے استعمال کیا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد
ہنوز گردش گردوں بکام پرویز است

(اشعار فارسی اقبال ص ۱۹)

(اگرچہ میرے تیشے نے پہاڑ کھود ڈالا ہے، لیکن زمانہ کی گردش پرویز کے مقصد کے مطابق ہو رہی ہے)۔

ندارد عشق سامانی ولیکن تیشۂ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خون پرویز است

(ص ۲۱)

(عشق بے سروسامان ہے، صرف اس کے پاس ایک تیشہ ہے جس سے پہاڑ کا سینہ

تراشتا رہتا ہے، لیکن اس پر خسرو کے قتل کا الزام نہیں لگایا جا سکتا)

بہر زمانہ بہ اسلوب تازہ می گویند
حکایت غم فرہاد و عشرت پرویز

(ص ۴۶)

(ہر زمانے میں غمِ فرہاد کی داستان اور عشرت پرویز کی حکایت نئے انداز میں پیش کی جاتی رہے گی)

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

(ص ۴۹)

(اہلِ فرہنگ نے سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کیسے کیسے دلکش بہانے تراشے ہیں)

فقر بخشی یا شکوہ خسرو پرویز بخش
یا عطا فرما خرد یا فطرتِ روح الامین

(ص ۶۶)

(فقر عطا کر یا خسرو پرویز کی شان و شوکت، یا عقل بخش دے یا روح الامین کی فطرت)

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست
آن تیشۂ فرہادی این حیلۂ پرویزی

(ص ۷۲)

(عشق اور بوالہوسی میں اتنا فرق ہے، کہ تیشۂ فرہاد عشق کی علامت اور پرویز کی حیلہ پردازی ہوسناکی کا سمبل ہے)

کوہکن تیشہ بدست آمد پرویزی خواست
عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت (ص ۹۹)

(کوہکن اپنی تیشہ تراشی کا بدلہ حکومت اور امیری چاہتا ہے، اب نہ عشرت خواجگی باقی

ہے اور نہ غلامی کی محنت)

⁂

مرزا غالب نے اپنے دو شعروں میں جو ابتدا میں نقل ہو چکے ہیں۔ خسرو پرویز کے تعلق سے ترنج زر اور طلاے دست افشار تلمیح استعمال کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تلمیح ہے، پورا فقرہ یوں ہے "ترنج زر دست افشار پرویز" طلاے دست افشار یا مشت افشار نرم سونے کا ڈلا تھا جو خسرو پرویز کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اور وہ اسے دباتا رہتا اور مختلف شکلیں بناتا رہتا تھا۔

بلاشبہ یہ تلمیح فارسی ادب اور ایرانی تاریخ میں شہرت اور اہمیت کی حامل ہے، اسی وجہ سے فارسی فرہنگوں، شاعروں کے دیوانوں اور تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، اس سے اس تلمیح کی حقیقت واضح ہوتی ہے،

کہتے ہیں خسرو پرویز کے خزانے میں ایک بیش قیمت سونے کا ڈلا تھا جو نرم سونے کا تھا، اتنا نرم کہ اس کو دباکر جو شکل چاہتے بنا لیتے، بادشاہ کے ہاتھوں میں وہ رہتا اور وہ اس سے کھیلتا رہتا تھا۔ ترنج زر اسی سے بنا تھا۔ ترنج مشہور ایرانی پھل ہے جو نارنج کے خاندان کا ہے اور اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے، فارسی نظم و نثر میں ترنج کا ذکر برابر آیا ہے، چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

از بلخ ترنج و نارنج و نیشکر و نیلوفر (حدود العالم)

⁂

ما بہ بلخ بودیم . . از قصدار . . نامہ ہای یوسف آوردند و ترنج و انار و نیشکر نیکو۔
(تاریخ بیہقی چاپ ادیب ۱۲۵)

⁂

درختان میوہ دار و نہال آنہا ترنج و نارنج و بادرنگ و لیمو و گل بنفشہ و نرگس و نیلوفر و مانند این در بوستان آوردند
(نوروز نامہ منسوب بخیام)

گہ ترنجی در بنان وگہ کمانی بر کتف
گاہ زو پیپنی بدست وگاہ رطلی بر دہان
(فرخی)

بادا رخ حاسدت ترنجیدہ و زرد
سر بر طبق نہادہ پیشت بہ چو ترنج
(سوزنی)

جہاں نسیم ترنج حدیث من بگرفت
کہ نخل زار معانی بہ بوستان منست
(خاقانی)

رسم ترنج است کہ در روزگار
پیش دہد میوہ پس آرد بہار
(نظامی)

ترنج زر یا ترنج زر دست افشار یا ترنج طلائے افشار فارسی زبان کی تلمیح ہے اور فارسی فرہنگوں میں آئی ہے، فارسی کی قدیم ترین فرہنگ لغت فرس[1] (ص ۱۵۹) میں زر مشت افشار کی تشریح ان الفاظ میں ملتی ہے:

"زری بود کہ چون کسری بدست فشردی نرم شدی، رودکی گوید
بادرفش کاویان و طاقدیس زر مشت افشار و شاہانہ کمر"

فرہنگِ جہانگیری میں ایک بار زر مشت افشار کے ذیل میں آیا ہے (ا: ۱۰۰۰)
"زر مشت افشار قدری زر بودہ در خزانہ خسرو پرویز مانند موم نرم کہ ہر صورتی کہ از آن خواستندی بی آتش ساختندی حکیم سوزنی گفتہ۔

زر مشت افشار بودی بوسہ اورا بہا
سبلت آورد و سزای وی زر مشت افشار شد"

اسی فرہنگ (۲: ۱۴۰۲) میں مشت افشار و مستغشار کے ذیل میں آیا ہے:

"مستفشار بمعنی مشت افشار است و شرح آن در ذیل لغت زرمشت افشار مرقوم شد۔"

استاد فرخی نظم فرمودہ :

بنام جود شں غواص اگر بجر شود　　نخست دست رساند بلولوی شہوار
چو کوہ کان کہ بکان شد بکام دولت او　　نخست میتن در زد بزر مستفشار"

رشیدی ۲ : ۱۴۱۲ میں آیا ہے :

"مشت افشار پارچۂ زری مانند موم نرم بود کہ پرویز داشت و ہر صورتی کہ می خواست از آن می ساخت۔"

مشت افشار کو پارچۂ زر نہ جانے کس ماخذ کی بنیاد پر کہا گیا ہے، اوّل زرمشت افشار کو بحذف زر کہنا درست نہیں، دوم یہ کہ یہ سونا تھا نہ کہ پارچہ۔

برہان ج ۲ ص ۱۰۱۱ میں زرمشت افشار کی تشریح اس طرح ملتی ہے :

"مشہور ہے کہ خسرو پرویز کے پاس طلاے مشت افشار تھا، وہ موم کی طرح نرم تھا اور اس سے جو شکل چاہتے بنالیتے، کہتے ہیں کیمیاگروں نے اس کو اس درجے تک پہنچادیا تھا۔"

اسی فرہنگ میں دوسری بار زرمشت افشار کے ذیل میں آیا ہے (ج ۲ ص ۱۰۱۲)

"یہ طلاے مشت افشار ہے جو خسرو پرویز کے خزانے میں تھا، موم کی طرح نرم کہ جس سے جو شکل چاہتے بنالیتے، کہتے ہیں صنعت اکسیر کے صنّاعوں نے اس کو اس درجے تک پہنچایا تھا۔"

(ج ۴ ص ۲۰۱۱)

تیسری بار مشت افشار (بحذف زر یا طلا) (ج ۴ ص ۲۰۱۱ کے ذیل میں آیا ہے:

"مشت افشار طلاے دست افشار باشد و آن در خزینۂ خسرو پرویز بودہ، گویند مانند موم نرم شدی و ہر صورتی کہ ازان خواستندی ساختندی۔"

غیاث اللغات ص ۲۳۷ میں ہے :

" زرّ دست افشار خسرو پرویز کا بیش قیمت سونا تھا جو موم کی طرح
نرم تھا، سراج میں ہے کہ بقول بعض کہ یہ سونا کیمیا کے ذریعے نرم کیا گیا
تھا۔"

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جہانگیری، رشیدی اور برہان میں مشت افشار کو بمعنی
زرمشت افشار قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے۔

آنندراج میں ترنج زر کے بارے میں ہے کہ پرویز نے زر دست افشار
سے ایک ترنج تیار کر لیا ہے، اور جب بھی چاہتا ہے تو ذرا سے ہاتھ کے فشار سے
موم کی طرح نرم کر لیتا۔

فرہنگ آنندراج میں مزید آیا ہے :

" طلای دست افشار مشہور است کہ خسرو پرویز داشت و مانند موم
نرم می شد و ہر صورتی کہ از ان می خواست می ساخت گویند اہل عمل
آنرا باین مرتبہ، سانیدہ بود در بجای آن سیم دست افشار نیز آمدہ،
طہوری۔

ترنج سیم دست افشار خسرو
انار سینۂ شیرین وشان کرو

غالب کہ سیم درینجا بمعنی طلا باشد، پس استعجاب درین شعر جامی
زر دست افشار زرّین لبس خش شو
بیا این سیم دست افشار بشنو
باعتبار معنی حقیقی سیم باشد کہ قصہ است۔"

یہاں تک تو بعض اہم فرہنگوں کے اقتباسات درج ہیں، اس سلسلے میں چند باتیں
خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہیں :

۱۔ اسدی طوسی نے لغت فرس میں زرمشت افشار اور طاقدیس کو کسری کی طرف
منسوب کیا ہے۔ اگرچہ لغت فرس کے دو اور نسخوں میں زرمشت افشار کا اندراج نہیں۔

۲۔ اکثر روایتوں میں دست افشار کے بجائے مشت افشار ہے، یہاں تک کہ عربی ماخذوں میں "مشتفشار" ایک الگ لفظ کی شکل میں ملتا ہے۔ مگر نظامی گنجوی کی اس بیت میں دست افشار ہی ہے۔ ملک را زر دست افشار در مشت۔
کز افشردن بروں می شد ز انگشت (گنجینۂ گنجوی ص ۸)

۳۔ بعض فرہنگوں میں زر مشت افشار کو طلسمی چیز بتایا ہے، لیکن تاریخی ماخذوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ذیل میں بعض تاریخوں کے سے زر مشت افشار کی توضیح پیش کی جا رہی ہے۔
زین الاخبار گردیزی (تالیف ۴۴۲ ـ ۴۴۳ھ) ص ۳۵ ـ ۳۶ طبع تہران تصحیح حبیبی میں ہے:

"پرویز کے پاس زر و جواہرات اور بیش قیمت اشیا کی فراوانی تھی، اس نے اتنی بیش قیمت چیزیں فراہم کرلی تھیں جو اس سے قبل کسی فرمانروا کے خزانے میں نہ تھیں، ان میں سے بعض چیزوں کے بارے میں کچھ عرض کیا جا رہا ہے۔ اس کے یہاں شطرنج کی ایک بساط تھی جس کے ایک طرف کی سطح سرخ یاقوت کی اور دوسری طرف کی زرد یاقوت کی بنی تھی۔ پانسہ بھی یاقوت اور زمرد کا تھا۔ اس کی قیمت ۳۲ ہزار پارۂ یاقوت تھی، علاوہ بریں اس کے پاس گنج عروس، گنج باد آورد، گنج دیبا خسروی، گنج سوختہ، زر مشتفشار تخت طاقدیس اور تخت پیش سار تھے۔"

مجمل التواریخ والقصص ص ۸۰ ـ ۸۱ میں زر مشت افشار کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"وخسرو پرویز را بود زر مشت افشار کہ برآن مہر نہادی و برسان موم نرم بود۔"

کتاب ایران بعد ساسانیاں (ص ۴۲۸) میں غرر ملوک الفرس کے حوالے سے یہ اطلاع ملتی ہے:

"پرویز کے دربار کے عجایب و نفائس میں ایک شطرنج کی بساط تھی جس کے

مہرے یاقوت اور زمرد کے بنے ہوئے تھے، پالنہ مونگے اور فیروزے کا تھا۔ اس کے علاوہ سونے کا ایک ڈلا تھا جس کا وزن دوسو مثقال تھا۔ یہی زر مشتقشار تھا جو موم کی طرح نرم تھا اور جس کو جس شکل میں چاہتے بنا لیتے۔"

سب سے زیادہ دلچسپ اور مستند اطلاع البیرونی نے بہم پہنچائی ہے، الجماہر میں آیا ہے:

" اغلب الظن فی الذھب المشقشار انہ للینہ وانہ کان فی ایام الفرس محظوراً علی العامۃ من جہۃ السیاسۃ وکان للملوک خاصتہ"۔ (ص ۲۳۴)

طلائے مشت افشار (مشتقشار) کے بارے میں گمان غالب ہے کہ یہ اپنی نرمی کی وجہ سے (اس نام سے موسوم) ہے، ساسانی عہد میں سیاسی وجہ سے عوام کے لیے (اس کا) استعمال ممنوع تھا۔ یہ زر محض ملوک کے لیے مخصوص تھا۔

چند سطر بعد الجماہر میں پھر آیا ہے:

" وقال حمزۃ ان سیبتہ کانت من کرۃ من ذھب محلول تقلبھا الملوک ولعاً بھا کما تقلب الآن اکرا للخالخ، وکان اذا قبض علیھا انسال الذھب من بین اصابعہ کانہ عصرہ فالعصر، والمشتقشار ھو شراب المعصور بالید ولا بالا رجل و شراب المعصور بالا رجل للعوام"۔ (ص ۲۳۵)

حمزہ کہتے ہیں سیبہ محلول سونے کی بنی ہوئی گیند (کرہ یا گولا) ہے جسے بادشاہ (ہاتھ میں لے کر) تفریحاً کھیلا کرتے ہیں۔ جیسے آج کل لوگ لخالخ کے گولے سے کھیلتے ہیں، اور جب اس گولے کو ہاتھ سے دباتے ہیں تو انگلیوں کے بیچ سے سونا ایسے ٹپکتا ہے جیسے کہ وہ شیرہ ہو جو نچوڑا جاتا ہے مشتقشار شراب ہے جو ہاتھ سے نچوڑی جاتی ہے، پاؤں سے نہیں، پاؤں سے جو شراب نچوڑی جاتی ہے وہ عام لوگوں کے لیے ہے اور جو ہاتھ سے نچوڑی جاتی ہے وہ خواص کے لیے ہے۔

اس کے بعد بیرونی نے امکان سیلان طلا کی بابت گفتگو کی ہے، اور تورتہ کے

ملوک کے سفر کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے، آخر میں اس ہدیے کا ذکر ہے جو حیرام بادشاہ صور نے سلیمان کو پیش کیا تھا۔

بیرونی کے اقوال کی اہمیت اس لحاظ سے بہت ہے کہ اس نے زرمشت افشار کو صرف پرویز اور کسریٰ سے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ بغیر کسی شرط کے سارے ساسانی بادشاہوں (ملوک فرس) سے منسوب کیا ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ یہ محض بادشاہوں سے مخصوص تھا، عوام اس کا استعمال نہیں کر سکتے تھے، اور یہ سونا اتنا نرم ہوتا تھا کہ ذرا سا دبائیں تو انگلیوں کے درمیان سے بہنے لگتا تھا۔

آخر میں فارسی شاعروں کے کچھ مزید شعر درج کیے جاتے ہیں، ان سے زرمشت افشار کی بعض خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔

خاقانی کا قصیدۂ ایوان بہت مشہور ہے، اس میں بے ثباتی دنیا کا نقشہ نہایت موثر انداز میں کھینچا گیا ہے، اس کے چند اشعار میں نوشیرواں اور پرویز کی شاہانہ زندگی کے عبرتناک انجام کی عکاسی کی گئی ہے۔ (دیوان ص ۲۵۸ - ۲۶۰):

مست است زمین زیرا خوردست بجای می در کاس سر ہرمز خون دل نوشروان	زمین مست و مدہوش ہے اس لیے کہ بجائے شراب کے اس نے ہرمز کے سر کے پیالے میں نوشیروان کے دل کا خون پیا ہے۔
بس پند کہ بود آنگہ در تاج سرش پیدا صد پند نواست اکنون در مغز سرش پنہان	اس کے تاج سر میں جو شہنشہی کی نشانی تھی نہ جانے کتنی ایسی نصیحتیں تھیں اور اب بعد مرگ بھی اس کے مغز سر میں سیکڑوں نصیحتیں پنہاں ہیں۔
کسریٰ و ترنج زر، پرویز و بہ زرّین بر باد شدہ یکسر با خاک شدہ یکسان	نہ کسریٰ کا ترنج زر باقی ہے اور نہ پرویز کی بہ زرّین کا نام و نشان ملتا ہے، دونوں برباد ہو کر خاک میں مل گئے۔
پرویز بہر بومی زرّین ترہ آوردی کردی ز بساط زر زرّین ترہ را بستان	پرویز جہاں بھی جاتا زرّین ترہ لے جاتا، اور بساط زر سے زرّین ترہ کو بوستان بنا دیتا۔

پرویز کنوں گم شد زان گم شدہ کمتر گوی
زرّین ترہ کو، برخوان، روکم ترکوا برخوان

شہنشاہ خسرو پرویز مرگیا، مرے ہوئے لوگوں کے ذکر کا وقت نہیں، اس کی شوکت کی نشانی زرّین ترہ کہاں ہے اس کو پکارو (پکارنے سے نہیں ملے گا) عبرت کے لیے آیت قرآنی "کم ترکوا" پڑھو۔

گفتی کہ کجا رفتند آن تاجوران اینک
زایشان شکم خاکست آبستن جاویدان

تو جانتا ہے کہ ایسے نامور بادشاہ کہاں چلے گئے، جان لو کہ ان کو زمین کھا گئی اور ہمیشہ کے لیے وہ ان کے پیٹ میں سما گئے۔

خون دل شیرین است آن می کہ دہد رزبن
ز آب و گل پرویز است آن خم کہ نہد دہقان

انگورستان سے جو شراب نکلتی ہے وہ شیریں کے دل کا خون ہے، اور شراب کی جو خم دہقان بناتا ہے وہ پرویز کی آب و گل سے بناتا ہے۔

نظامی گنجوی کی حسب ذیل بیت میں زردست افشار آیا ہے:

ملک را زردست افشار درمشت
کز افشردن برون می شد ز انگشت

(گنجینہ ص ۸۷)

اس سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ مشت افشار کی جگہ نظامی نے دست افشار لکھا ہے، اکثر قدیم ماخذوں میں مشت افشار ہے، نظامی کی بیت سب سے قدیم ماخذ ہے جس میں مشت افشار کے بجائے دست افشار ہے۔

۲۔ بادشاہ اس کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور کبھی کبھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کو دباتا تھا تو انگلیوں کے درمیان سے سونا نکلتا، اس کی تصدیق البیرونی کے

بھی بیان سے ہو جاتی ہے۔
آخر میں عرفی شیرازی (م ۹۹۹ھ) کا ایک[11] مشہور شعر نقل کیا جاتا ہے:

دست[12] الماس ہمت بود گروا بینی اکنونش
ترنج زر دست افشار پرویز جہاں بینی

اکثر نسخوں میں 'دلت' ہی ہے، اس صورت میں شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے دوست تیرا دل ہمت کے اعتبار سے ایسا سخت تھا جیساکہ ہیرا ہوتا ہے جو کسی طرح توڑا ہی نہیں جا سکتا، لیکن اب اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اتنا نرم ہو گیا ہے جیساکہ پرویز کے ہاتھ میں زر دست افشار سے بنا ہوا ترنج جس کی نرمی کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا دبانے سے سونا انگلیوں کے بیچ سے بہہ نکلتا تھا۔

لیکن اگر 'دلت' کے بجائے 'دلم' پڑھا جائے تو وہ ساری خاصیت جو محبوب کے دل کی تھی وہ خود شاعر کی اپنی ہو جائے گی۔ اور میں اسی قرأت کو بہتر سمجھتا ہوں اس لیے اس بیت سے پہلی بیت میں ضمیر متکلم کا استعمال ہوا۔ ضمیر غائب کا نہیں، ملاحظہ ہو:

بحفظ گریہ مشغولم اگر بینی درونم را
ز دل تا پردۂ چشم دو شاخ ارغوان بینی

طلائے دست افشار یا مشت کی جو تفصیلات فرہنگوں، تاریخوں اور شعرا کے کلام سے پیش کی گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تلمیح کافی دلچسپ ہے، اور اسی بنا پر غالب نے بھی اس کو استعمال کیا، لیکن نہ بھولنا چاہیئے کہ ترنج زر اور طلائے دست افشار الگ تلمیح نہیں، یہ دونوں ایک ہی تلمیح ہے۔ یعنی ترنج زر دست افشار پرویز۔

حواشی

ا؎ ذوق کا بھی ایک شعر ہے جس میں طلائے دست افشار استعمال ہوا ہے:

نکلے کان سے فولاد تا ابد ھــــرگز   عجب نہیں ہے بغیراز طلای دست افشار

۲ سامانی خاندان کا بانی اردشیر بابکان تھا، اس نے اپنے دادا ساسان کے نام پر ۲۲۶ء میں اس خاندان کی بنا ڈالی۔ جو ۴۲۶ برس تک قائم رہی، اس خاندان کی سیاسی وتمدنی برتری کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا رہا، اور اسی تمدنی برتری کی گہری چھاپ اسلامی تمدن پر نظر آتی ہے۔

۳ قباد کا بیٹا تھا، تاریخ میں انوشروان کے نام سے مشہور ہے، ۵۳۱ء سے ۵۷۹ تک فرماں روائی کی، اس نے مزدکیوں کا خاتمہ کیا، اس کے زمانے میں شاہی اقتدار کا استحکام اور معاشرتی نظام کا احیا ہوا، اس کا دور علمی وفلسفیانہ تمدن کا شاندار عہد سمجھا جاتا ہے، نوشیرواں عدل وانصاف کا نمونہ تھا، اس کے عدل کی مناسبت سے مشرق میں متعدد حکایات ملتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اسی عادل بادشاہ کے عہد میں ہوئی تھی۔

۴ خسرو پرویز کے سات مشہور خزانے تھے جن کے نام شاہ نامے میں فردوسی طوسی نے اس طرح لکھے ہیں: ۱۔ گنج عروس ۲۔ گنج باد آور (= باد آورد) ۳۔ گنج دیبۂ خسروی۔ ۴۔ گنج افراسیاب ۵۔ گنج سوختہ ۶۔ گنج خضرا ۷۔ گنج شادورد۔

برہان قاطع میں آٹھ خزانے ملتے ہیں، آٹھویں خزانے کا نام گنج بار تھا۔ (ج ۳ ص ۱۸۳۶)۔

۵ عرفی کے اس مصرعہ میں پورا فقرہ آیا ہے: ترنج زردست افشار پرویز جہاں بینی۔

۶ میرے پیش نظر لغت فرس کے تین نسخے ہیں، ۱۔ تصحیح عباس اقبال آشتیانی، تہران ۱۳۱۹، ۲۔ تصحیح ذکر دبیر سیاقی چاپ دوم ۱۳۵۶، ۳۔ تصحیح دکتر مجتبائی ۱۳۶۵۔ اول الذکر نسخے میں یہ تلمیح ملتی ہے، لیکن بقیہ دونوں سے خارج ہے، اس بنا پر اس اندراج کے بارے میں شک باقی رہ جاتا ہے۔

۷ نام کتاب موبد سروش بن کیوان بن کامگار از پیروان آذر کیوان ررمست افشار یا زردست افشار است، دیکھیے بعض فواید لغوی کتاب الجماہر بیرونی بقلم دکتر محمد معین،

۱ برہان ۳: ۱۳۴۲ میں ہے کہ طاقدیس کے لغوی معنی مانند طاق ہے، (دیس = مانند)، خسرو پرویز کا تخت تھا جو اسے فریدوں سے ملا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس میں آسمان و نجوم کے حالات ظاہر

ہوتے تھے، اس میں تین درجے تھے جن میں ارکان دولت کی نشست ہوتی۔ برہان کے حاشیہ میں ہے کہ بیزانسی مورخ Kedrenos نے تئو فاں کی ایک کتاب (جو قرن ہشتم کی تھی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہرقل قیصر کے ہاتھوں ۶۲۴ء میں جب خسرو پرویز ہار گیا تو قیصر کا خ گنزک میں وارد ہوا: اس میں بت خسرو کو دیکھا جو ایک مہیب شکل کا تھا، پرویز کی ایک تصویر دیکھی جو محل کے بلند مقام پر ایک تخت پر رکھی ہوئی تھی، اس تخت کی شباہت ایک بڑے گنبد کی تھی جو آسمان کے مانند تھا۔ اس کے گرداگرد چاند، سورج اور ستارے چمک رہے تھے جنھیں کافر پرستش کرتے تھے، اور شاہ کے ایلچیوں کی بھی تصاویر تھیں جن کے ہاتھ میں عصا تھا، اس گنبد میں ایسے آلات لگا دیے گئے تھے جن سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔ اور بجلی کی کڑک کی آواز کان میں آتی تھی۔ (نیز رک: ایران بعہد ساسانیان ص ۴۲۶ ببعد)۔

فردوسی نے طاقدیس کی تفصیل درج کی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

ز تخت کہ خوانی ورا طاقدیس

کہ بنہاد پرویز در اسپریس

۹ اس حقیقت کی تصدیق نظامی کی اس بیت سے ہوجاتی ہے:

ملک را زد دست افشار در مشت

کز افشردن برون می شد ز انگشت

۱۰ ہرمز چہارم نوشیرواں کا بیٹا، خسرو پرویز کا باپ اور ساسانی خاندان کا بائیسواں فرمانروا تھا جس نے ۵۷۹ تا ۵۹۰ء حکومت کی تھی۔

۱۱ قرآن سورۂ دخان (۴۴) آیت ۲۵ تا ۲۹۔ کَمْ تَرَكُوا مِن جَنّٰتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ۝ كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ۔ (وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے، یہ اسی طرح ہوا اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث بنا دیا، نہ تو ان پر آسمان و زمین

کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت دی گئی)۔

۱۲ؔ یہ عرفی کے اس قصیدے سے لیا گیا ہے جو سنائی کے قصیدے کی پیروی میں لکھا گیا ہے، اس کا مطلع اس طرح ہے :

زخود گردیده بربندی چگویم کام جان بینی
همان کز اشتیاق دیدنش زادی همان بینی

سنائی کا مطلع یہ ہے :

دلا تاکی درین منزل فریب این وآن بینی
یکی زین چاه ظلمانی برون شو تا جهان بینی

۱۳ؔ ہندوستانی نسخوں میں ولت ہے، لیکن دلم زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی

حسین بن منصور حلّاج کے بارے میں ایک مختصر گزارش (طبقات الصوفیہ کی روشنی میں)

حسین بن منصور حلاج مقتول ۳۰۹ھ کی شخصیت ان کے اپنے زمانہ سے آج تک بہت ہی مبہم رہی ہے۔ ان کے قتل کو جوں جوں زمانہ گذرتا گیا لوگوں نے ان کے بارے میں متعدد اور ناقابل یقین حد تک افسانے، داستانیں اور کرامات بیان کرنا شروع کردیں یہاں تک کہ ان کو الوہیت کے مقام تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

حلاج کی شخصیت اردو فارسی ادب میں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے شاعروں نے منصور، حلاج، انا الحق اور دار و رسن کی ترکیبات کو استعاروں کے بطور خوب خوب استعمال کیا ہے۔ عام طور پر حلاج کے اصلی نام حسین کے بجائے ان کو ان کے باپ منصور کے نام سے موسوم کردیا گیا ــــ چنانچہ عرف عام میں وہ منصور حلاج کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

حسین بن منصور اپنے عقاید و اعمال سے قطع نظر دنیائے تصوف میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اب تک مشرق و مغرب میں حلاج پر بہت کام ہو چکا ہے اور متعدد مضامین اور کتابیں ان کے متعلق لکھی جا چکی ہیں جن میں ان کی زندگی و فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی بحث کی گئی ہے۔ فرانسیسی مستشرق ماسینوں نے حلاج پر کافی تحقیق کی ہے، حلاج کے عربی

دیوان کا انتقادی متن مع مقدمہ شائع کیا ہے اسی مستشرق کے توسط سے حلاج کی کتاب "طواسین" جو شطحیات پر ہے، شائع ہوئی ہے۔

یہ مختصر سا مضمون کوئی تحقیقی مقالہ نہیں اور نہ اس میں اُن مطالب و مضامین کا احاطہ یا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حلاج پر لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کا مقصد ایک عام قاری کو ان شہادتوں سے روشناس کرانا ہے جو تصوف کی ایک قدیم کتاب یعنی طبقات الصوفیہ املائی شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی میں درج ہیں۔ طبقات الصوفیہ آج سے تقریباً ہزار سال قبل اور حسین بن منصور حلاج کی وفات کے پونے دو سو سال بعد کی تحریر ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری ۳۹۶ھ میں متولد ہوئے اور ۴۸۱ھ میں وفات پائی۔ ہرات میں مدفون ہیں۔ وہ دنیائے اسلام کے بزرگ ترین مشائخ، عالی مقام صوفیوں اور دانشمندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ فارسی و عربی میں کئی کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ طبقات الصوفیہ شیخ الاسلام کی املا شدہ کتاب ہے جس کو ان کے شاگردوں نے تحریر و تدوین کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب نفحات الانس کا دارو مدار اسی کتاب پر ہے اور کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا ہو بہو چربہ ہے۔

طبقات الصوفیہ ہم کو حلاج کے بعض معاصر بزرگوں سے روشناس کراتی ہے اور حلاج کے بارے میں ان کی شہادتیں بھی اس کتاب میں دستیاب ہیں۔ یوں تو طبقات الصوفیہ سے قدیم تر اور بھی کئی کتابیں و مآخذ ایسے موجود ہیں جو اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن طبقات الصوفیہ موثق و مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ایجاز اور بیباکانہ حق گوئی کی صفات سے بھی متصف ہے۔ اس کتاب میں حسین بن منصور حلاج کے باب میں کم و بیش پندرہ مشائخ کا حوالہ دیا گیا ہے جو سب کے سب حلاج کے ہم عصر تھے۔ ان میں حلاج کے دوست، ہم عصر مشائخ، ان کے اُستاد اور شاگرد اور ان کے صاحبزادے سب ہی تو شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر حلاج کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔ شیخ الاسلام کی حق گوئی ان کے استناد اور ان کی صدق نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ حلاج کے بارے میں جو

نظریات انھوں نے اپنے یا دوسروں کے بیان کیے ہیں وہ ان کی انصاف پسندی اور عادلانہ روش کے آئینہ دار ہیں۔

حسین بن منصور حلاج کا تعارف کراتے ہوئے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"حلاج کی کنیت ابو المغیث تھی وہ پارس کے شہر البیضا[۱] کے رہنے والے تھے وہ کوئی پیشہ ور دھنے (حلاج) نہ تھے اور ان کے حلاج کہلانے کی یہ وجہ نہیں وہ واسط[۲] و عراق میں رہے۔ جنید[۳] و نوری[۴] کی صحبت اٹھائی۔ عمرو عثمان[۵] مکی، فوطی[۶] اور دوسرے مشائخ کے شاگرد تھے۔ وہ خراسان گئے اور وہاں سے چھپتے چھپاتے مرو پہنچے۔ ان کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ ان کو زندیق[۷] کچھ شعبدہ باز اور دوسرے ان کو محقق و موحد کہتے ہیں۔

"شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ان کے متعلق مشائخ میں اختلاف رائے ہے۔ بیشتر ان کو رد کرتے ہیں مگر تین مشائخ ایسے ہیں جو ان کو قبول کرتے ہیں۔ ان میں ایک ابو العباس[۸] عطا، دوسرے عبداللہ خفیف[۹] اور تیسرے شیخ ابو[۱۰] القاسم نصر آبادی ہیں۔ ان کے علاوہ مشائخ میں سے کوئی اور ان کو نہیں مانتا۔"

"بو عبداللہ خفیف ان کو امام ربانی کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام نے بو عبداللہ[۱۱] باکو سے حلاج کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے بھی سوال اپنے استاد بو عبداللہ خفیف سے کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس شخص کے متعلق کیا کہوں جو کہتا ہو ؎

وعدنی واحدی بتوحید صدق

ما الیہ من المسالک طرق

(میرے مولی نے مجھ کو توحید صدق کے ذریعہ منتخب فرمالیا۔ مسالک میں سے کوئی راستہ اس کی طرف نہیں جاتا)۔

ہوالحق للحق حق
لابس ملبس حقائق حق

(وہ حقِ محض ہے اور حق کے واسطے حق ہے (حقیقت الحق ہے) چھپانے والے نے حق کے حقائق کو خلط ملط کردیا ہے)

"شبلیؒ فرماتے ہیں کہ جو کچھ وہ (حلاج) کہتے ہیں، میں بھی وہی کہتا ہوں لیکن مجھے دیوانگی نے بچالیا اور ان کو فرزانگی لے ڈوبی......
شبلی نے حلاج کو پھانسی لگائے جانے کے وقت ان کی پھانسی کے پھندے کے پاس کھڑے ہوکر یہ آیت قرآن پڑھی :

اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ[۱۳] (کیا ہم نے تجھ کو دنیا بھر کی حمایت سے منع نہیں کیا)۔ اور وہ قاضی جس نے حلاج کو پھانسی کا حکم دیا کہتا تھا کہ حلاج تو پیغمبری کا دعویٰ کرتا تھا اور یہ (شبلی) خدائی کا دعویدار ہے

" ایک روز حلاج، جُنید کے گھر گئے"۔ انھوں نے دریافت کیا کون ہے؟ حلاج نے کہا "حق"۔ جنید نے کہا تو حق نہیں البتہ بحق ہے ..... ای خشبۃ تفسد ھا؟ کون سی لکڑی اور پھندہ تیرے لیے چرب کیا جائے؟"

جنید کا یہ جملہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ حلاج کے عقاید کے کس قدر مخالف اور ان سے کس حد تک بیزار تھے اور یہ کہ ان کے دل و دماغ میں وہ جذبات پرورش پا رہے تھے جو بعد میں حقیقت کی شکل میں نمودار ہوئے۔ عمرو عثمان مکی حلاج کے اُستاد تھے۔ وہ ان کی حرکتوں سے سخت نالاں تھے اس بارے میں شیخ الاسلام کا قول طبقات الصوفیہ میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:

" ان (حلاج) پر جو بلا نازل ہوئی وہ ان کے اُستاد عمرو عثمان مکی کی دعاء کے سبب ہوئی۔ اُستاد نے ایک رسالہ توحید اور صوفیوں کے علم کے بارے میں تصنیف کیا۔ انھوں نے اس کو چپکے سے اڑا لیا اور

لوگوں کو آشکارا دکھا دیا۔ بات بہت نازک تھی، لوگ سمجھ نہ سکے اور
ان سے منکر ہو گئے اور ان پر کلامیٔ ہونے کا الزام لگایا اور قطع تعلق کر لیا۔
انھوں نے حلاج پر لعنت بھیجی اور کہا "الٰہی اس پر کسی ایسے کو مسلط فرما جو اس
کے ہاتھ کاٹ دے، پاؤں کاٹ دے، آنکھیں نکال لے اور سُولی پر چڑھا
دے۔" یہ سب ان کے ساتھ ہوا اور اُستاد کی دُعا کے سبب ہی ہوا۔"

عبدالملک اسکاف حلاج کے شاگرد تھے اور شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی
کے والد کے ساتھی۔ بقول شیخ الاسلام "عبدالملک اسکاف نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی۔
وہ شریف حمزہ عقیلی کے ساتھ بلخ میں رہے ...... میرے والد کا کہنا ہے کہ عبدالملک
اسکاف نے مجھ سے کہا کہ جب انھوں نے حلاج سے دریافت کیا کہ اے شیخ عارف کون ہوتا
ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ عارف وہ ہے جس کو سہ شنبہ کے دن ذیقعدہ سے چھ روز
قبل ۳۰۹ھ میں بغداد میں باب الطاق لے جا کر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے جائیں۔
اس کی آنکھیں نکال لی جائیں اور اُلٹا سُولی پر لٹکا دیا جائے۔ پھر اس کو جلا دیں اور اس
کی راکھ ہوا میں بکھیر دی جائے۔ عبدالملک کہتے تھے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان
کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو انھوں نے کہا تھا۔" شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"مَیں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ یہ سب
کچھ پیش آئے گا یا محض یوں ہی کہتے تھے کہ ان کے ساتھ ایسا واقعہ پیش
آئے گا۔ ان کا ایک اور شاگرد تھا جس کا نام ہیکل تھا۔ اس کو بھی حلاج
کے ساتھ ہی مار دیا گیا۔ اس دن سے اس کا نام شاگرد الحسین پڑ گیا۔ ابوالعباس
عطار کو بھی ان ہی کے سبب مارا گیا۔"

ان کے ایک اور شاگرد ابراہیم فاتک تھے وہ کہتے تھے کہ جس دن حسین منصورؒ کو
پھانسی دی گئی اسی دن میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور کہا۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے جو
تو نے اپنے بندہ حسین کے ساتھ کیا۔ فرمایا میں نے اپنا راز اس پر آشکار کیا وہ اس
نے دنیا والوں سے کہہ دیا۔ مَیں نے اس کو انعام دیا وہ مغرور ہو گیا اور خلق کو اپنے ساتھ

ملالیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوالقاسم بغدادی نوری اور جنید کے ساتھی تھے۔ جُنید ان کی عزت کرتے۔ وہ چوں کہ حلاج سے منسوب تھے لہٰذا لوگوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔

حسین بن منصُور کے حلاج کہے جانے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ اپنے ایک دُھنے (حلاج) دوست کی دکان پر بیٹھے تھے۔ دوست کو کسی کام سے بھیج دیا اور کہا میں نے اس کا وقت لیا ہے۔ پھر اُنگلی سے روئی کی طرف اشارہ کیا۔ دُھنی ہوئی روئی ایک طرف اور بنولے ایک طرف ہو گئے۔ اسی لیے اُن کو حلاج کہا جانے لگا۔"

حلاج سے منسوب کرامات کا ذکر کرتے ہوئے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"طوطی کو زندہ کرنے کا عمل ارادی نہ تھا۔ جب طوطی مر گئی تو حلاج نے کہا کیا تم چاہتے ہو اس کو زندہ کردوں؟ بس ایک اشارہ کیا اور وہ زندہ ہو گئی ۔۔۔ ۔۔ ایک مرتبہ شام میں کلیسا میں گئے۔ وہ لوگ کثرت سے چراغ جلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا اگر میں سب چراغ جلا دوں اور تم کو کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے تو کیا دو گے؟ یہ کہا اور اُنگلی سے اشارہ کیا سب چراغ جل اٹھے۔"

اسی ضمن میں بوعبداللہ خفیف سے سُنی ہوئی حکایت نقل کرتے ہیں کہ:

"جس مکان میں انھیں قید کیا گیا وہ بڑا مکان تھا، خلیفہ کے محل سے چند فرسنگ کے فاصلے پر۔ حلاج کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑی تھی۔ انھوں نے وضو کیا۔ ان کا انگوچھا مکان کے دوسرے حصّے میں تھا۔ وہیں سے انھوں نے اس طرف ہاتھ بڑھایا اور انگوچھا اُٹھا لیا۔ اس بارے میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں۔ یہ سب کرامات[۱۵] نہ تھیں۔ ان میں کچھ شعبدے اور جادوگری بھی شامل تھی۔ لیکن وہ حقیقت سے عاری نہ تھے۔"

شیخ الاسلام فرماتے ہیں حلاج سے پوچھا گیا توحید کیا ہے جواب دیا قدیم کا حدث سے جدا کرنا۔ توحید کے بارے میں حسین بن منصُور حلاج کا شعر ہے کہ:

مواجید حق اوجدالحق کلہا
وان عجزت عنہا فہوم الاکا بر
(حق کی تلاش کرنے والوں کو حق پورا مل گیا، اور جو بڑے عقل مند و
دانشور تھے وہ اس سے بے بہرہ رہے)۔

.... وہ کہتے ہیں کہ جس کو انوار توحید نے مست کر دیا ہو اس کو تجرید کی عبادت سے ڈھک دیا جاتا ہے اس لیے کہ سکر وہ حالت ہے جس میں سارے اسرار فاش کر دیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ: جو حق تک نور ایمان کے ذریعہ پہنچنا چاہتا ہے اس کی مثال ایسے آدمی کی سی ہے جو ستاروں کی روشنی کے ذریعہ سورج کی تلاش کرے۔ پھر فرمایا انوار الٰہی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ فارس بغدادی کہتے ہیں کہ کسی نے حسین بن منصور سے مرید کے بارے میں سوال کیا انھوں نے جواب دیا: مرید وہ ہے جو اللہ کے قصد سے روانہ ہوتا ہے اور جب تک پہنچ نہیں جاتا رکتا نہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ مرید دونوں جہاں کے اسباب سے دور رہتا ہے اور اس کا نشانِ راہ تیرا کرم ہے جو ان لوگوں پر نازل ہوتا ہے جو اس کے لائق ہوں۔ حلاج کہا کرتے تھے کہ الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ میں تیرے مقام شکر سے برآنے سے عاجز ہوں بس تو خود ہی میرا شکر قبول فرما کہ تو سراپا شکر ہے۔

" وہ کہتے خدایا اوّل تو تو نے ہم کو اپنے وجود کی برکت سے پیدا کیا اور اپنے فضل سے ہماری راہنمائی فرمائی۔ اب ہم کو اپنی بہشت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ہمارے پاس ساز و برگ نہیں، اگر ہو سکے تو ایسا ہی کر جیسا تو نے شروع میں کیا۔ اب اپنے فضل سے اس کام کو اپنی برکت کے ساتھ ختم فرما ورنہ کام شروع تو کیا لیکن حسن انجام کو نہ پہنچایا۔"

شیخ الاسلام نے حسین بن منصور حلاج کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں:

انت بین الشغاف والقلب تجری
مثل جری الدموع فی الاجفان

(تو دل اور غلافِ دل (دل کی جھلی) کے درمیان اس طرح رواں ہے جیسے کہ پلکوں

اور آنکھوں کے درمیان آنسو)

وحل الضمیر جوف فوادی
کحلول الارواح فی الابدان

(تو میرے دل میں اس طرح اُتر آیا جیسے کہ روح بدن میں آ جائے)

"شیخ الاسلام شیخ بو عبداللہ باکو سے روایت کرتے ہیں کہ احمد نے جو کہ حسین بن منصور حلاج کے بیٹے تھے خجند میں بو عبداللہ سے کہا کہ میں نے اپنے باپ کی زندگی کی آخری رات ان سے کہا کہ مجھے وصیت کیجیے۔ انھوں نے کہا: اس سے پہلے کہ تیرا نفس تجھ کو کسی کام میں پھنسا دے تو اس کو کسی شغل میں لگا دے۔ میں نے کہا بابا۔ کچھ اور کہیے، کہنے لگے دنیا والے خدمت (الٰہی) میں کوشاں ہیں تو ایسا کام کر کہ اس کا ایک ذرہ عملِ ثقلین سے بہتر و برتر ہو۔ بیٹے نے دریافت کیا وہ کون سا کام ہے؟ حلاج نے کہا معرفت یعنی اس کی شناخت۔"

شیخ الاسلام حسین بن منصور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"وہ کچھ جادوگری کے کرتب ضرور جانتے تھے۔ یہ بات ثابت ہے۔ وہ اس سے بے بہرہ نہ تھے اور اس سے دست بردار بھی نہ ہوئے ... ... حلاج کے متعلق بہت سی جھوٹی باتیں کہی گئی ہیں اور بہت سے بے بنیاد اور ناقابلِ یقین اتہامات ان پر تھوپے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ متکلموں نے غیر معروف کتابیں اور دلائل ان کے نام سے منسوب کر دیے ہیں۔ جو پوشیدہ ہونا چاہیے تھا وہ ان سے فاش ہو گیا۔

"وہ امام ہیں لیکن (رموز عرفانی) ہر ایک سے کہتے اور ضعفا پر تحمیل کرتے اور شریعت کو روندتے تھے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسی سبب ہوا۔ وہ اپنے تمام دعووں کے باوجود دن رات میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے۔ اپنے قتل سے ایک روز قبل دن اور رات میں پانچ سو رکعت نماز پڑھی۔ وہ کہتے تھے کہ ان کو الہام کے مسئلہ کی بنا پر مارا گیا۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جو کچھ کہتے پیغمبری (کا دعویٰ) ہے اِن

پر ظلم تھا۔ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"حلاج کا قتل ان کی سزا تھی جو ان کے لیے نقصان کا باعث ہوئی اور اس سے ان کی بزرگی میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ یہ بڑی سوجھ بوجھ کا کام ہے۔ اگر وہ کامل ہوتے اور خلق اللہ کے لیے انصاف کے کوشاں تو ان کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ اس بات میں وہ مقصر تھے۔ بات اہل سخن سے کرنا چاہیے تاکہ راز کھل نہ جائے۔ اگر وہی بات نا اہل سے کی جائے گی تو وہ اس پر بوجھ بن جائے گی اور تجھ کو اس سے نقصان پہنچے گا اور اس کی سزا ملے گی..... وہ جو کچھ کہتے اس میں خود بھی خام تھے، اگر پختہ ہوتے تو وہ بات ان کے لیے مقام و نفس و زندگی بن جاتی اور کوئی ان سے منکر نہ ہوتا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں "... ... نہ تو بات کہنے کا وقت تھا اور نہ کوئی محرم راز۔ میں ان سے بھی بڑی بات کہتا ہوں اور عام لوگوں کے سامنے کہتا ہوں لیکن وہ انکار نہیں کرتے اور وہ بات راز ہی رہتی ہے۔ راز پنہاں ــــ جو شخص اس کا اہل نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہی نہیں۔" اس بات کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری بات میں ایک نور ہے جس میں بات سننے والا مستغرق ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بات اس کا اپنا سرمایہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بات کا نور ہی ہے جو اس کی زندگی میں سرایت کر جاتا ہے۔ مزید فرمایا کہ حلاج عین جمع کے موضوع پر بات کرتے ... ... یہ بات نازک ہے اور خطرناک بھی ... . توحید کی بات کرنا چاہیے نہ کہ اپنی اور دوسروں سے سنی سنائی۔"

"شیخ الاسلام نے اپنے تحریر کردہ رسالوں میں اس بات کی طرف تفصیل سے اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اپنا ڈھول کیسے پیٹا جا سکتا ہے۔ وہ اسرار سے بے خبر اور خود میں گم تھا۔ ... اس نے قتل (کے جذبہ) سے مغلوب ہو کر شریعت کو ترک کر دیا۔ ایک چشمہ تھا جس کو اس کے استاد نے بند کر رکھا تھا۔ حلاج نے اس کو کھول دیا۔ کنویں کی گہرائی سے ڈھول پیٹنے سے حشمت و جاہ کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔

--

"میں نہ توان کی کیفیت کو قبول کرتا ہوں اور نہ ان کے مسلک کو۔ نہ توان کے قتل کو دیدۂ احترام سے دیکھتا ہوں اور نہ رد کرتا ہوں۔ البتہ مشائخ میں ان کا یہ کام بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی سیرت اور ان کا ظاہر دونوں عوام کی طرح اور ان کا باطن خواص کے باطن کی مانند تھا۔ مرتعش بھی اس بات سے متفق ہیں۔"

شیخ الاسلام اپنے شاگردوں و مریدوں کو مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں خود نہ تو ان کو مانتا ہوں اور نہ رد ہی کرتا ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ ان کو نظر انداز کرو۔ تاہم جو کوئی ان کو قبول کرتا ہو اس کو میں اس شخص کی نسبت جو رد کرتا ہو زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

امید کرتا ہوں کہ اس مختصر سی گزارش سے حلاج کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا، اور اگر ازالہ نہ ہو سکا تو کم از کم اتنا تو ہو سکے گا کہ یہ موضوع لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے گا۔

حواشی

۱۔ البیضاء یا دژ سپید صوبہ فارس (ایران) کے ایک شہر کا نام ہے۔ اصطخری کے بقول یہاں ایک سفید قلعہ تھا جو دور سے نظر آ جاتا اور اسی مناسبت سے اس کا نام بیضاء یا دژ سپید ہو گیا۔ قدیم زمانہ میں اس کا نام نسار تھا۔ اب بیضاء شیراز کا ایک گاؤں ہے۔

۲۔ واسط نام کے کئی مقامات عراق میں ہیں۔ کوفہ اور بصرہ کے درمیان بھی ایک جگہ کا نام واسط ہے۔ وہ اوروں کی نسبت بیشتر معروف ہے۔ یہ شہر تقریباً ۸۳ھ میں حجاج بن یوسف نے آباد کرایا۔ بصرہ اور کوفہ سے مساوی فاصلہ (پچاس فرسنگ) پر واقع ہونے کے سبب اس کا نام واسط پڑ گیا۔

۳۔ ابوالقاسم ابن محمد بن جنید بغدادی مشہور عالم دین، فقیہ اور بزرگ صوفی ہیں۔ ۲۹۷ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم توحید کے بارے میں عوام کے سامنے گفتگو کی۔ امام شافعی

کے پیرو تھے اور سری سقطی، حارث محاسبی و محمد قصاب کے شاگرد۔

۴ احمد بن محمد نوری بغداد میں پیدا ہوئے۔ بزرگ مشایخ و علمائے وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ جنید، سری سقطی، محمد علی قصاب اور احمد ابوالحواری کے ساتھیوں میں تھے۔ ذوالنون مصری کو بھی دیکھا تھا۔ ان کو اور نوری کو بغداد میں طاؤس العباد کے لقب سے یاد کیا جاتا۔

۵ عمرو عثمان مکّی کا پورا نام عمر بن عثمان بن کرب بن غصص تھا اور ابوعبداللہ کنیت۔ وہ حسین بن منصور حلاج کے اُستاد اور یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کو کلامی کہہ کر مکہ سے باہر نکال دیا گیا اور لوگوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ سنہ ۲۹۱ھ میں وفات پائی۔

۶ ابوبکر نام۔ فوطہ یعنی لنگی بُننے یا بیچنے کا کام کرتے اسی لیے فوطی کہلائے۔ حلاج کے اُستاد تھے۔ سنہ ۳۲۲ھ میں انتقال ہوا۔

۷ زندیق پہلوی لفظ زندیک کا معرب ہے جس کے معنی مجرم و گناہگار ہیں۔ بعد میں یہ لفظ ملحد، بے دین، دہریہ اور مانی کے پیروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

۸ احمد بن محمد سہل بن عطا نام، ابوالعباس کُنیت۔ اپنے زمانہ کے مشہور علما، مشایخ و بزرگ صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حسن وزیر نے حلاج کو قتل کرایا اس نے ابوالعباس عطار سے ان کے بارے میں رائے دریافت کی۔ انھوں نے کہا تو خود اس قدر گنہگار ہے کہ ان کے مرتبہ کو سمجھ نہ پائے گا۔ بہتر ہو کہ رعایا کا غصب کیا ہوا مال لوٹا دے۔ وہ یہ سُن کر اتنا برہم ہوا کہ ان کو بھی مروا دیا۔ یہ واقعہ بھی سنہ ۳۰۹ھ کا ہے جس سال کہ حلاج کو پھانسی لگی۔

۹ عبداللہ خفیف حلاج کے معاصرین میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حلاج سے ملنے ان کے قید خانہ میں پہنچ گئے۔ جو شخص حلاج کی نگہبانی پر مامور تھا۔ اس سے حلاج کی کیفیت معلوم کی۔ اس نے بتایا کہ تیرہ من وزنی زنجیروں میں جکڑے حلاج ہر روز ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کرتے۔ جو کھانا لایا جاتا اس کو ذرا دیر دیکھتے اور اُنگلی کے اشارے سے واپس کر دیتے۔ انھوں نے عبداللہ خفیف سے ابوالعباس عطار کا حال دریافت کیا اور کہا کہ اگر ان سے ملو تو کہہ دینا کہ وہ رُقعے ہرگز سنبھال کر نہ رکھیں۔

۱۰ ابوالقاسم نصرآبادی کا پورا نام ابراہیم بن محمد بن محمویہ تھا۔ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ علومِ دینی

دُنیوی کے عالم اور اپنے زمانہ کے مشہور صوفی مشائخ میں سے تھے۔ ۲۹۶ھ میں مکہ میں وفات پائی۔

۱۱ ابوعبداللہ باکو کا نام علی بن محمد بن عبداللہ اور کنیت ابن باکو تھی۔ آخر عمر میں شیراز کے ایک غار میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ وہاں کے سارے مشائخ و صوفی ان سے ملنے اسی غار میں جایا کرتے۔ ۴۴۲ھ میں وفات پائی۔ امام قشیری اور شیخ ابوسعید ابوالخیر کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

۱۲ شبلی کا نام جعفر بن یونس تھا۔ مصر کے رہنے والے تھے۔ بغداد آئے اور وہاں خیر نساج کی مجلس میں توبہ کی۔ جنید کے شاگرد ہیں۔ خود بھی بلند پایہ عالم، فقیہ اور مذکر تھے۔ مالکی عقیدہ رکھتے اور موطا ان کو حفظ تھی۔ ۳۳۴ھ میں وفات پائی۔ بغداد میں دفن ہیں۔ ۸۷ سال کی عمر پائی جنید کے بقول وہ صوفیا کے سر کے تاج تھے۔

۱۳ قرآنِ کریم سورۂ الحجر آیت ۷۰، جزو ۱۴۔

۱۴ کلامی وہ شخص جو معرفت الٰہی کو استدلال کے ذریعہ حاصل کرنا چاہے۔ علم کلام وہ علم ہے جس میں دینی عقائد کے اثبات اور بدعت گذاروں، کافروں اور دیگر گمراہوں کی تردید عقلی دلائل کے ذریعے انجام دی جائے۔ یہ علم ان مباحث کی پیداوار ہے جو پہلی صدی ہجری میں ہی مسلمانوں کے درمیان توحید، تجسیم، جبر و اختیار، ایمان و کفر وغیرہ اعتقادی مسائل کے بارے میں چھڑ گئے تھے اس علم کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے بقول چوں کہ قدیم ترین مسئلہ جس کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا کلام اللہ اور قرآن کریم کے خلق ہونے کا مسئلہ تھا۔ اس لیے اس کو علم کلام کا نام دے دیا گیا۔ دوسروں کے بقول چوں کہ اس علم کی بنا محض نظریات ہیں اور عمل سے اس کا سروکار نہیں لہٰذا اس کو کلام کہنے لگے۔ واللہ اعلم۔

۱۵ کرامات کے متعلق شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کے نظریات اور طبقات الصوفیہ میں مندرج دو حکایتیں توجہ طلب ہیں:

"بوبکر کفشیری کہتے تھے کہ صحرائے بنی اسرائیل سے گذر رہا تھا کہ میرا دل چاہا کہ ایک بڑی روٹی اور باقلا کھانے کو مل جاتا۔ اسی لمحہ صحرا میں باقلا فروش کی آواز گونجی اور دو میرے

پاس لے آیا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں یہ کرامات نہیں۔ علم تصوف میں اس کو قابلِ سرزنش سمجھا جاتا ہے۔"

" ایک درویش جنگل میں بیٹھا تھا کہ آسمان سے ایک سونے کا پیالہ ٹھنڈے پانی سے بھرا اُترا۔ درویش نے کہا خدایا تیری عزت کی قسم میں اس وقت تک نہ پیوں گا جب تک کہ تو کسی اعرابی کو نہ بھیجے کہ وہ مجھ کو چانٹے لگائے اور پھر پانی پلائے۔ وگرنہ میں غرور کے خوف سے کرامات سے حاصل شدہ پانی نہیں پیوں گا۔ تو قادر ہے کہ میرے پیٹ کو پانی سے بھردے۔ مقصد یہ کہ ظاہری کرامات فریب سے خالی نہیں ہوتیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ حقیقت کو کرامات سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل حقیقت خود کرامت ہے۔" (طبقات الصوفیہ، کابل ۱۳۴۱ ص ۳۵ – ۴۳۴)

۱۶ ازبکستان کا مشہور شہر جو دریائے سیحون کے کنارے آباد ہے۔ روسی اقتدار کے دوران اس کا نام بدل کر استالن آباد کر دیا گیا اور اس کو جمہوری ازبکستان کا پایۂ تخت بنا دیا۔

۱۷ عبداللہ بن محمد نام، ابو محمد کنیت۔ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ بغداد میں جا بسے۔ عراق کے بڑے مشایخ میں شمار ہوتا ہے۔ ۳۲۸ھ میں انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے عراق کے تین عجائبات ہیں: شبلی کی فریاد، مرتعش کے نکات اور جعفر خلدی کی حکایات۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک اہم پیشکش

دیوانِ غالب (کشمیری)

اسد اللہ خان غالب

ترجمہ کار

غلام نبی ناظر

غالب کے اردو دیوان کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ شائع ہوگیا ہے جس میں ایک صفحے پر کشمیری زبان میں ترجمہ اور مقابل کے صفحے پر اردو زبان میں اصل غزل ہے۔
فوٹو آفسیٹ طباعت، عمدہ سفید کاغذ مضبوط جلد اور دلکش سرورق کے ساتھ

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ : غالب انسٹی ٹیوٹ ۔ نئی دہلی

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

عہدِ غالب کے فارسی ادب کی خصوصیات

مشہور کہاوت ہے کہ جب چراغ بجھنے لگتا ہے تو بھڑک اٹھتا ہے۔ عہدِ غالب کے فارسی ادب کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے فارسی ادب پر حتٰی سرسری نگاہ بھی اس نتیجے پر پہنچا دیتی ہے کہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اس دور کا فارسی ادب گذشتہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ فارسی ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر اس دور کے علما، شعراء اور ادبا نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اس کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی اس دور میں لکھی گئیں جن کی مثال گذشتہ ادوار میں مشکل سے نظر آتی ہے۔

غالب دہلوی کے انتقال (۱۲۸۵ھ) کے بعد علامہ اقبال لاہوری واحد ایسے متفکر شاعر ہیں جن کے فارسی کلام پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے اور جن کا کلام آج بھی فارسی دنیا میں صاحبانِ نظر کی توجہ کا مرکز ہے۔ اگر علامہ اقبال نے اپنے اظہارِ خیال کے لیے فارسی کو منتخب نہ کیا ہوتا تو درحقیقت بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں فارسی ادب غالب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہوتا۔

یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ ہندوستان میں شاہی درباروں نے ہمیشہ فارسی

زبان وادب کی سرپرستی کی۔ فارسی ہندوستان میں درباری زبان رہی۔ اس کے نتیجے میں علما و شعرا و ادبا کی ایک کثیر تعداد درباروں سے وابستہ اور اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں علمی و ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ چوں کہ فارسی زبان اور اس کے ادب کا دربار سے ایک اٹوٹ تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس وجہ سے اس کی قسمت بھی اس دربار سے وابستہ ہو گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک جیسے ہی انگریزوں نے مغلوں کی نام نہاد حکومت بھی ختم کر دی اور مختلف ریاستوں میں آزاد اور نیم آزاد حکومتوں پر بھی انگریزوں کا غلبہ ہو گیا تو فارسی زبان و ادب بھی بتدریج زوال پذیر ہوا۔ اس کے بعد حیرت انگیز سرعت کے ساتھ فارسی زبان و ادب ہندوستان میں قصۂ پارینہ بن گئے۔

مغل سلطنت کے آخری دور میں مغلوں کے بے دست و پائی کے نتیجے میں خود ان کے مقرر کردہ متعدد ریاستوں کے صوبے دار اور دیگر صاحبانِ اقتدار نے مرکزی حکومت سے اپنا تعلق توڑ لیا تھا اور آزاد و مستقل حکمرانوں کی حیثیت سے حکومت کرنے لگے تھے۔ اس وجہ سے اب صرف دہلی کا ایک دربار نہیں تھا بلکہ مختلف علاقوں میں متعدد دربار وجود میں آگئے تھے۔ ان تمام درباروں کے مسلمان اور غیر مسلمان سربراہوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ دہلی کے علاوہ رام پور، اودھ، حیدر آباد، بھوپال، ملتان، لاہور، عظیم آباد وغیرہ ایسے مراکز تھے جہاں اس دور میں فارسی شعرا اور ادبا کی سخاوت مندانہ سرپرستی کی گئی۔ فارسی زبان و ادب کے حامی ان ادبی مراکز کی کثرت کی وجہ سے بھی فارسی ادب کو اس زمانے میں پہلے سے زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

انیسویں صدی کے نصف اول (۱۸۰۶ تا ۱۸۵۷ء) میں تقریباً سو کے قریب فارسی شاعر اور ادیب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فارسی آثار کی تخلیق میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس دور کے تقریباً پچاس شعرا کے فارسی دواوین اور دیگر منظوم آثار آج بھی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح تقریباً پچاس ایسے شعرا کے نام تذکروں وغیرہ میں مذکور ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو زندہ رکھا، لیکن ان کے آثار آج ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ اس دور کے شعرا نے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی

غرض کہ تمام قدیم اور روایتی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

غلام محی الدین شایق (م: ۱۲۴۹/ ۴ _ ۱۸۳۳ء)، صہبائی (م: ۱۲۷۴/ ۱۸۵۷ء) غالب دہلوی (م: ۱۲۸۶ _ ۱۸۶۹)، شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی (م: ۱۲۵۰/ ۵ _ ۱۸۳۴)، چندو لعل شادان (م: ۱۲۶۱/ ۱۸۴۵)، مومن خاں مومن (م: ۱۲۶۸/ ۲ _ ۱۸۵۱)، قاضی محمد صادق اختر (متولد: ۱۲۰۱/ ۷ _ ۱۷۸۶)، محمد قدرت اللہ قدرت (متولد: ۱۱۹۹/ ۱۷۸۵)، مولانا فضل عظیم (م: ۱۸۵۷) ابن مولوی فضل امام (م: ۱۲۴۳/ ۱۸۲۸)، شاہ تراب علی تراب (م: ۱۲۷۵/ ۱۸۵۸)، مفتی صدر الدین آزردہ (م: ۱۲۸۵/ ۱۸۶۸)، مصطفیٰ خاں حسرتی، شیفتہ (م: ۱۲۸۶/ ۱۸۶۹)، صاحبِ عالم مارہروی (م: ۱۲۸۸/ ۱۸۷۱)، الفت حسین شاہ فریاد (م: ۱۲۹۷/ ۱۸۸۰)، سید مظفر علی اسیر (م: ۱۲۹۹/ ۲ _ ۱۸۸۱)، محمد یار خاں آفی، لبھاون لعل شادان وغیرہ کا شمار اس دَور کے اہم اور اُستاد شعرا میں ہونا چاہیئے۔

غالب کو اس دَور کے فارسی شعرا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب کی فارسی شاعری اس زبان کی تقریباً ایک ہزار سالہ شاندار روایات کی امین ہے۔ وہ فارسی کو اپنی ازلی دست گاہ سمجھتے تھے۔ خود ان کے بقول وہ فارسی کے محقق تھے، اور میزان (ترازو) فارسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ حالاں کہ قاطع برہان میں وہ لسانی اعتبار سے بعض اشتباہات کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے فارسی زبان، اس کے ادب کی تاریخ، اس کے پس منظر وغیرہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو علمی اور پُرجوش کوششیں کی ہیں وہ اس دَور کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر صہبائی نے کہا تھا:

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بہ خاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید[۱]

مومن خاں مومن کو فارسی میں وہ دست گاہ حاصل تھی کہ اہلِ ایران انھیں ایرانی سمجھتے تھے[۲] مومن کا تعلق اس ولی اللہی خاندان سے تھا جو ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی روایات کو ہر صورت محفوظ اور برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل رہا۔ اس خاندان سے ذہنی وابستگی

کی وجہ سے، ہندوستان پر انگریزوں کے روز افزوں غلبے کو خاموشی سے برداشت کرنا مومن کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو ایک اجنبی حکومت کے تسلط کے خلاف جدوجہد کی دعوت دی:

این عیسویان بلب رسانند — جان من وجان آفرینش
تا چند بخواب ناز باشی — فارغ ز فغان آفرینش
مومن شده ہم زبان عرفی — از بہر امان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست — ای فتنہ نشان آفرینش

مومن کا یہ لب ولہجہ اور اس منظومے میں ان کا مقصد فارسی شاعری کی تاریخ میں غالباً ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔

انگریز ہندوستان آ گئے، ان کا اقتدار بھی قائم ہو گیا، اس اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی روایات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ فارسی زبان و ادب ان روایات کے ادراک کا اہم وسیلہ تھا۔ انھوں نے مجبوراً فارسی کی طرف توجہ کی جس کے نتیجے میں یورپ کے بعض اہل فضل کو فارسی میں دست گاہ حاصل ہو گئی اور اس دور میں فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار اہل یورپ نے شعر کہے اور دیگر علمی آثار اپنی یادگار چھوڑے۔

فرانسو گوڈلین یا گوڈلیپ کوینس نے فارسی میں شعر کہے، لیکن ان کی فارسی نثر ان کی فارسی شاعری سے بہتر ہے۔ کوینس نے فارسی اور اُردو میں کئی منظوم و منثور کتابیں تالیف کی تھیں۔ جن میں ان کی مثنوی ظفر الظفر آج بھی محفوظ ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے سیاسی حالات بیان کیے گئے ہیں۔

ولیم بیلے کی مفتاح التواریخ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کتاب میں بے شمار تاریخی قطعات بیلے کی فارسی شاعری میں مہارت کے ترجمان ہیں۔ بیلے نے فارسی شاعری میں اپنی استعداد کا اس طرح کسر نفسی کے ساتھ اظہار کیا ہے:

اگرچہ مؤلف را در گفتن شعر و سخن دست گاہی نیست، اما از آنجا کہ بعضی اوقات

جہتِ طبع آزمائی، تاریخی چند نوک ریزاین، ہیچ مدان گردیدہ، آن ہمہ را درمقام خودش درضمن این اوراق ثبت نمود۔

اس دَور کے اکثر شاعر فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں باقاعدہ طبع آزمائی کرتے تھے جو اسی دَور کی خاصیت ہے۔ اس دوَر میں اُردو شاعری کو خاص طور پر اہلِ علم کی نظر میں اس درجہ اعتبار حاصل ہو گیا تھا کہ حتیٰ ایرانی الاصل شعرا نے بھی اُردو میں دواوین مرتب کیے۔ محمد رضا متخلص بہ نجم کا خاندان اسی دَور میں اصفہان سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ نجم نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہے اور دیوان مرتب کیے[۶۵]۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی کا رواج آہستہ آہستہ زوال پذیر تھا، لیکن اس کی ادبی، علمی اور تہذیبی اہمیت سے کوئی منکر نہیں تھا۔ اس دَور میں بھی فارسی جاننے والوں اور اس کے حامیوں کی تعداد میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ منشی عبدالکریم مؤلف "تاریخ پنجاب" نے اردو اخبارات کو صرف اس وجہ سے فارسی میں منتقل کیا تھا کہ فارسی اب بھی ہندوستان کی مطبوع و محبوب زبان تھی۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ ہیں:

چون اہلِ ہندوستان را فارسی مطبوع و مرغوب است، لہذا از اخبار اُردو درین زبان ترجمہ نمود[۶۶]

تعجّب کی بات ہے کہ شمالی ہندوستان جہاں فارسی زبان وادب کا صدیوں تک بول بالا رہا تھا اور جہاں اس زبان نے شعرا و ادبا، علما اور دانشوروں کے ذہن و قلم پر حکمرانی کی تھی، وہاں اس زبان کا مستقبل خطرے میں تھا۔ اس کے برخلاف جنوبی ہندوستان خاص طور پر کرناٹک میں فارسی کی طرف غیر معمولی توجہ دی جا رہی تھی۔ کرناٹک کے والا جاہی نوابوں نے اس دَور میں فارسی کو ایک نئی زندگی بخشی تھی۔ والا جاہ پنجم محمد غوث خاں متخلّص بہ اعظم (۱۲۵۹/ ۱۸۴۳ – ۱۲۷۲/ ۶ – ۱۸۵۵) خود شاعر و ادیب تھے اور شاعروں کے زبردست سرپرست بھی[۶۷]۔ انھوں نے ۱۲۶۲/ ۱۸۴۶ میں ایک مجلس مشاعرہ تشکیل دی۔ اس مجلس میں جو ہفتے میں ایک بار منعقد ہوتی تھی، صرف فارسی کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر اس میں شرکت ممکن نہیں تھی۔ شیریں سخن خاں

متخلص بہ راقم اور مولوی میران محی الدین قادری واقف اس مجلس میں حَکَم اور سید محمد خالص اس مجلس کے منشی تھے۔ مصرع طرح دے دیا جاتا تھا، صرف وہی شعرا اس مجلس میں اپنا طرحی کلام پیش کرتے جنھیں نواب صاحب کی طرف سے اجازت ہوتی۔ نواب صاحب کی طرف سے مجلس مشاعرہ میں پیش کیے جانے والے کلام پر اعتراضات کی اجازت تھی۔ اگر کسی مسئلہ پر بحث طویل ہو جاتی اور حَکَم کی مداخلت کے باوجود تصفیہ نہ ہو پاتا تو نواب صاحب سے رجوع کیا جاتا جن کی رائے سب کے لیے قابلِ قبول ہوتی۔ مرتضیٰ بینش اس مجلس کے ایک رُکن تھے۔ ان کے یہ دو اشعار اس مجلس کی کیفیت کو واضح کرتے ہیں:

گفتم غزل این بزم سخن را بہ مثل ہر یک بتپش خوش است بی عیب و خلل
شد مطلع او اعظم و مقطع راقم واقف و قدرت دو فرد چیدۂ زغزل[۹]

اُنیسویں صدی کے شعرا کو انگریزی حسن دیکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ بعض شعرا نے انہی میں سے صنم منتخب کر لیے۔ حالانکہ شاہ تراب علی تراب فرنگیوں کے مظالم سے خائف تھے، لیکن پھر بھی انھوں نے اسی قوم کی ایک حسینہ کو اپنے صنم خانۂ دل میں جگہ دی:

دل بزلفش ندھی، قید فرنگست تراب گو بہ اعجاز مسیحی صنم انگریزا ست[۱۰]

انگریزوں سے ربط ضبط بڑھنے کی وجہ سے ہندوستانی بعض انگریزی الفاظ بلا ارادہ اپنی اپنی زبانوں میں استعمال کر رہے تھے۔ اس دَور کی فارسی میں بھی انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے جس کی مثال اس سے پہلے کی ہندوستانی فارسی زبان میں نظر نہیں آتی۔ اس صورتِ حال کی بہترین مثال خود غالب کی فارسی نظم و نثر ہے۔

اُنیسویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی اور بے اطمینانی کے باوجود چند ایرانی علما و شعرا و ادبا ہندوستان آئے اور اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں سرگرم عمل رہے۔ بہرحال اس امر کا اقرار ضروری ہے کہ اس دَور میں کوئی عُرفی، غزالی مشہدی، نظیری یا ابو طالب کلیم جیسا ایرانی شاعر ہندوستان میں نظر نہیں آتا جس کو فارسی شاعری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہو۔

میرزا محمد خان متخلص بہ نصیبی (م: ۱۲۶۱/ ۱۸۴۵) فرزند موسیٰ بیگ کو ایران کے قاچاری بادشاہ فتح علی شاہ نے فخر الشعرا کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ ہندوستان آگئے اور اودھ کے غازی الدّین حیدر کے دربار سے وابستہ ہو گئے[11]۔ نصیبی نے مثنوی چندارانی یا بحر وصال نظم کی جس میں ملک خورشید اور چندارانی کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے[12]۔

اس دَور کے شعرا و ادبا نے بڑی تعداد میں ہندوستانی داستانوں کو فارسی نظم و نثر میں بیان کیا ہے جن میں سسّی پنوں[13]، مرزا صاحباں[14]، داستان کامروپ و کام لتا[15]، بے تال پچیسی[16]، ہیر رانجھا[17]، طوطی نامے کی داستانیں[18]، سنگھاسن بتیسی[19]، پدماوت[20]، سوہنی مہی وال[21]، نل دمن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دربارِ اکبری کے ملک الشعرا فیضی فیاضی نے مہابھارت کی ایک داستان نل دمن کو سب سے پہلے فارسی نظم میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد غالباً کسی دوسرے فارسی شاعر یا ادیب نے اسے فارسی میں بیان نہیں کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں عبرتی عظیم آبادی نے اس داستان کو اعجازِ الموت[22] کے نام سے فارسی نثر میں بیان کیا اور اس طرح اس دور کو گذشتہ ادوار کے مقابلے میں ایک خاص ادبی امتیاز بخشا۔ اسی طرح بیتال پچیسی داستانوں کا وہ مجموعہ ہے جو سنسکریت کی معروف کتاب کتھا سرت ساگر میں شامل ہے۔ مہاراجہ مادھو کشن جنھوں نے انوار سہیلی کا پنجابی میں ترجمہ کیا تھا[23]، اس دَور میں ان داستانوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ناوقت موت کی وجہ سے یہ پروجیکٹ نامکمل رہا۔ وہ صرف تین داستانیں فارسی میں منتقل نہیں کر سکے تھے جنھیں بعد میں ان کے بھائی اندر کشن بہادر نے ایک مقدمے کے ساتھ ۱۲۵۶/ ۴۱ ــ ۱۸۴۰ میں مکمل کیا۔ اس دَور سے پہلے یہ داستانیں فارسی میں پیش نہیں کی گئی تھیں۔

اس دور کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں سندھ کے تالپور شاہی خاندان کے میر صوبہ دار خان فرزند میر فتح علی خان تالپور نے فارسی دیوان کے علاوہ نظامی گنجوی کی پیروی میں ایک خمسہ نظم کیا۔ ان کی پانچ مثنویوں کے نام ہیں :

مثنوی فتح نامہ[۲۴]، مثنوی سیف الملوک[۲۵]، مثنوی خسرو شیرین[۲۶]، ماہ و مشتری[۲۷] اور جدائی نامہ[۲۸]

انیسویں صدی کے نصف اول میں تاریخ کی متعدد کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ دنیا کی عمومی تاریخیں، ہندوستان کی تواریخ، ہندوستان کے بعض علاقوں کی تاریخ اور اسی طرح ہندوستان کے بعض حکمران خاندانوں کی تاریخ اس دور میں بار بار لکھی گئیں۔ اس دور میں جو تاریخیں فارسی میں لکھی گئیں وہ کمیت کے لحاظ سے لازمی طور پر کسی بھی گذشتہ پچاس سال کے دوران لکھی جانے والی فارسی تواریخ سے زیادہ ہیں۔ زبدۃ الاخبار تالیف غلام محی الدین قادری[۲۹] سراج التواریخ از نور محمد[۳۰]، جامع التواریخ مصنفہ قاضی فقیر محمد[۳۱]، مرأۃ گیتی نما تالیف کریم خان جھجری[۳۲]، مراۃ الاحوال جہاں نما[۳۳] وغیرہ وہ عمومی تاریخیں ہیں جو عہدِ غالب میں فارسی میں لکھی گئیں۔

اس وقت مرأۃ الاحوال جہاں نما کا ذکر ضروری ہے۔ اس اہم تاریخ کے مصنف احمد بن محمد علی بن محمد باقر اصفہانی معروف بہ بہبہانی ہیں۔ ان کا تعلق ایران کے معروف مجلسی خاندان سے تھا۔ وہ ۱۱۹۱/ ۱۷۷۷ء میں کرمان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۲۰۲/ ۸ ـ ۱۷۸۷ء میں ہندوستان آ گئے۔ یہاں مختلف علاقوں کا سفر کیا اور بالآخر عظیم آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بہبہانی نے متعدد کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی انیس کتابوں کا مراۃ الاحوال میں ذکر کیا ہے۔ مراۃ الاحوال جہاں نما میں ہندوستان کی معاصر سیاسی تاریخ کے علاوہ سماجی اور ثقافتی تاریخ بھی قلم بند کی گئی ہے۔ بہبہانی نے ہندوستانی تہواروں کے بارے میں بھی اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں۔ وہ بسنت کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ :

قبل از نوروز سلطانی نیک ماہ می شود و بزرگان مجلس خود را برنگ زرد آرایند و عامۂ خلایق تمام رغوت۔ خود را زرد کنند و بہ یک دیگر تہنیت و مبارکباد گویند۔ این نیز درمیان مسلمانان اندک رواجی گرفتہ است[۳۴]۔

ہرنام سنگھ کی تاریخ سعادت جاوید[۳۵]، کرشن دیال کھتری دہلوی کی اشرف التواریخ[۳۶]

کو مان سنگھ کی تاریخ ممالک ہند[۳۷] منتخب التواریخ مصنفہ سدا سکھ لال[۳۸] وغیرہ ہندوستان کی عمومی تواریخ ہیں جو عہدِ غالب میں لکھی گئیں۔

محمد رضا متخلص بہ نجم کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے یہ اس دور کے کثیر التصانیف عالم ہیں۔ انھوں نے بحرِ ذخار کے نام سے ایک دائرۃ المعارف ترتیب دیا جو مختلف موضوعات پر متعدد کتابوں پر مشتمل ہے۔ اُردو اور فارسی میں ان کے مفقود الاثر دواوین کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مظاہر الادیان، مظاہر العالم، مجمع الملوک، اخبارِ ہند، نغمۂ عندلیب، مفاتیح الریاست اور زبدۃ الغرایب ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے خطی نسخے آج بھی مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں اور مصنف کے علمی تبحر کا ثبوت[۳۹]۔

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا تعلق بھی بیشتر درباروں سے تھا۔ عام طور پر پادشاہوں ان کے امرا اور وزرا کی فرمائش پر تاریخیں لکھی جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں کسی مؤرخ کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سماجی یا سیاسی حالات پر حتیٰ بجا تنقید بھی کر سکے۔ اس دور میں حاکمانِ وقت کے وقار اور اعتبار پر انگریزوں نے کاری ضرب لگائی۔ ان کا رہا سہا بھرم بھی ختم کر دیا۔ عام انسان بھی ان کی کس مپرسی کی حالت سے واقف ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں اب لوگ ان کے اچھے بُرے کاموں پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرنے لگے۔ اس دور کی ایک کتاب فراست نامہ[۴۰] اپنی نوعیت کے اعتبار سے فارسی تاریخ نویسی میں اس وجہ سے امتیازی شان کی حامل ہے کہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات پر شدید تنقید ہے۔ فراست نامہ دین محمد کی تصنیف ہے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ دین محمد نے اس کتاب میں ہندوستانیوں کی علمی و فنی زُبوں حالی کا ذکر اور ماتم کیا ہے۔ اور انگریزوں کی علوم و فنون میں ترقی کو سراہا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا لب و لہجہ نہایت سخت اور تیکھا ہے جس کی وجہ سے یہ تصنیف فارسی تاریخ نویسی میں منفرد سمجھی جانی چاہیے۔ ہندوستانیوں کی علمی عقب ماندگی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

باوجود این تہی مغزی، لاف از دانش انگریزی زدہ، جز نقل اصلی ندارند۔ ای کاشکہ رہ سپر فراست انگریزی در ریاست و سیاست مدنی می بودند و ریاضت

بدنامی می کشیدند تا بہ این ذلت وخواری و ناہنجاری و گرفتاری نمی رسیدند. کار امارت را بجائی رسانیدہ اند کہ باوجود دولت و ثروت غلام حلقہ بگوش و غاشیہ عبودیت بر دوش انگریزان شدہ، شرم از نامردی و کم ہمتی خود نمی کنند[۱۲۱] دین محمد نے بہادر شاہ ظفر کو بھی نہیں بخشا اور ان الفاظ میں ان کا مذاق اڑایا کہ :

ہندستان اگر بدولت می رسند و دست قدرت می یابند، سہ چہار زن می کنند، بلکہ درین زمان متمولان از صدہا می گذارند، چنانچہ الان بہادر شاہ ظفر کہ چون سلاطین دیگر دست قدرت ندارد، ہر ہفتہ نکاح جدید می نماید۔ باوجودی کہ ضعف شیخوخیت بر طبعش مستولی است، مگر حرصش غالب[۱۲۲]۔

مفتی علی الدین لاہوری نے عبرت نامے[۱۲۳] میں جو سکھوں کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس دور کے دیگر مورخوں پر نکتہ چینی اور تاریخ نویسی میں ان کے جانب دارانہ رویے کی مذمت کی ہے۔ علی الدین نے بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے اس دور کی تاریخ نویسی میں بدلے ہوئے رجحان کا علم ہوتا ہے۔ اسی دور کے لالہ موہن لال کی عمدۃ التواریخ پر وہ تبصرہ کرتے ہیں کہ :

لالہ سوہن لال نامی سکنۂ لاہور کتابی درین ضمن نوشتہ کہ بہ تطویل انجامیدہ و بسبب ہم مذہبی واکثر مقامات رعایت نمودہ، از نفس الامر بر کنارہ ماندہ و درآن سوای ایجاد و ذکر ملک گیری سنگھان دیگر چیزی مندرج نیست[۱۲۴] امرناتھ پنڈت کشمیری دہلوی اور بوٹا شاہ کی تاریخ کی کتابوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ :

دوم دیوان امرناتھ پنڈت کاشمیری دہلوی کتابی نوشتہ کہ آن مثل وقایع سالیانہ، بہ عبارت مختصر و مغلق بودہ کہ مطالعہ اش در برآوردن مطالب، شایق را بدقت می اندازد[۱۲۵]۔

بوٹا شاہ کی تصنیف[۱۲۶] کے متعلق ان کا خیال ہے کہ :

ونیز بوٹا شاہ نامی از سکنۂ لودھیانہ کتابی نوشتہ کہ باوصف متانت و رنگینی فقرات، بہ سبب تطویل اکثر مطالب درآن مہمل ماندہ و سامع را جز سمع خراشی از آن حاصلی نیست[۱۲۷]۔

غالب کی دستنبو[۱۱۹] فارسی نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ غالب نے اپنی اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اصل فارسی الفاظ استعمال کریں اور عربی کے وہ الفاظ جو فارسی میں عام طور پر استعمال ہوتے تھے ان سے احتراز کریں۔ غالب کا یہ رویہ کس حد تک مناسب ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس پر ایک مفصل بحث کی جاسکتی ہے، جس کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

اس دور میں تاریخ نویسی کے ضمن میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ بعض انگریز حاکموں نے بھی ہندوستان کی گزشتہ اور معاصر تاریخ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے مختلف ہندوستانی دانشوروں کو یہاں کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے پر مامور کیا۔ قاضی محمد صادق اختر نے معروف مورخ ایلیٹ کے لیے مخزن الجواہر[۱۲۰] سید محمد باقر علی خاں نے ہنری پڈ کوک کے لیے تاریخ ہنری[۱۲۱] التفات حسین خان نے سر ہنری رسل کی فرمائش پر نگارستان آصفی[۱۲۲] اور جنرل جون مالکم کے منشی عبدالرزاق نے انھی کے اشارہ پر تذکرۂ نرمل تالیف کیں[۱۲۳]

عہد غالب کی سیاسی تاریخ کی ایک قابل ذکر بات[۱۲۴] یہ بھی ہے کہ مورخین نے اپنی اپنی تصانیف میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں محفوظ بعض مآخذ کا استعمال بھی کیا ہے۔ حسین نوہانی نے اس دور میں جنوبی ہند میں واقع کورگ کی تاریخ کنڑی اور انگریزی زبانوں میں موجود مراجع کی بنیاد پر مرتب کی[۱۲۵]۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انیسویں صدی حالانکہ فارسی کے زوال کے آغاز کا دور ہے، لیکن جنوبی ہند کے اس دور دراز علاقے میں جہاں فارسی جاننے والے بھی بظاہر کم رہے ہوں گے، راجا کے ایما پر فارسی میں تاریخ کا لکھا جانا، فارسی کے چلن اور اس کے اعتبار کا ثبوت ہے۔

انیسویں صدی میں چند سفرنامے بھی لکھے گئے۔ فارسی زبان میں یہ سفرنامے اپنے تاریخی اور سماجی مطالب کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ عزت اللہ دہلی میں رہتے تھے۔ وہ یہاں سے کشمیر، تبت، چین، تاشقند، کاشغر، قوقان، سمرقند اور پشاور گئے۔ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں اٹک واپس لوٹے۔ مآثر عزت اللہ یا

سفرنامۂ عزت اللہ[۸۶] ان کے اسی سفر کی روداد ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا TRAVELS IN CENTRAL ASIA کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ ہوا جو ۱۸۷۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا ہے۔

علی مرزا مفتون دہلوی عظیم آباد میں سکونت پذیر تھے۔ وہ حج کے ارادے سے ۸، ربیع الثانی ۱۲۴۱/ ۹ ـ ۱۸۲۵ کو کلکتے پہنچے۔ حج سے واپسی پر وہ بندر عباس آئے جہاں سے انھوں نے شیراز، اصفہان، تہران اور مشہد کا سفر کیا۔ ایران میں اپنے سفر کے دوران انھیں گاؤں، قصبوں اور متعدد چھوٹے بڑے شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس زمانے کے قاچاری بادشاہ محمد شاہ سے بھی ملے۔ انھوں نے عمارتوں، ان پر کتبوں، ایرانیوں کی سماجی اور سیاسی زندگی وغیرہ کا غائر مطالعہ کیا اور اپنے چشم دید حالات کو ایک سفرنامے زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار[۸۷] میں قلم بند کیا۔ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس سے پہلے کسی ہندوستانی نے ایران کا اتنا مفصل سفرنامہ فارسی میں لکھا ہو، اس کا فی الحال علم نہیں۔ اسی طرح تاریخ یوسفی[۸۸] میں یوسف خان کمبل پوش نے پہلی بار فارسی میں انگلستان کے اپنے سفر کے حالات بیان کیے ہیں۔

کیفیات مکانات گوڑ، لکھنوتی تالیف شیام پرشاد منشی، تفریح العمارات تالیف لالہ سیل چند[۸۹]، احوال شہر اکبرآباد مصنفہ مانک چند[۹۰]، سیر المنازل تالیف سنگین بیگ[۹۱] اور تذکرۂ نرمل (یعنی قلعۂ نرمل) تالیف عبدالرزاق فارسی میں وہ کتابیں ہیں جو اس دور میں لکھی گئیں اور جن میں پہلی بار صرف ہندوستانی شہروں، اور ان کی تاریخی عمارتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ عرفا، علما، خوشنویسوں، امرا اور فارسی شعرا کے تذکرے بھی اس دور میں بڑی تعداد میں مرتب ہوئے۔ حتیٰ اردو شعرا کے تذکرے بھی اس دور میں فارسی زبان ہی میں لکھے گئے۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں تذکرے جتنی زیادہ تعداد میں لکھے گئے، اس کی مثال گذشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ مجموعۂ نغز[۹۲]، طبقات سخن[۹۳]، ریاض الوفاق[۹۴]، تذکرۂ سرور[۹۵]، نشتر عشق[۹۶]، اشارات بینش[۹۷]، مصحفی کے تین تذکرے[۹۸]، نتائج الافکار[۹۹]، صبح وطن[۱۰۰]، آفتاب عالمتاب[۱۰۱]۔ وہ چند فارسی اور اردو

شعرا کے اہم تذکرے ہیں جو اس دور میں مرتب کیے گیے۔ اس کے علاوہ شاہ تراب علی تراب نے اصول المقصود، محمد ابوالحیات قادری پھلواری نے تذکرہ الکرام اور مولوی سید محمد علی صدپوری نے مخزن احمدی میں عرفا کے احوال بیان کیے ہیں۔

عبرتی عظیم آبادی نے اس دور میں معراج الخیال کے علاوہ جس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ۲۰۵ فارسی شعرا کا ذکر ہے، ایک دوسرا تذکرہ ریاض الافکار بھی مرتب کیا۔ ریاض الافکار فارسی کے ۱۰۱ نثر نویسوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس میں عبرتی نے فارسی ادبا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ غالباً پہلا تذکرہ ہے جس میں صرف نثر نویسوں کے احوال درج کیے گئے ہیں۔ عہد غالب میں سنسکرت، ہندی اور پنجابی کے علاوہ انگریزی سے بھی فارسی میں تراجم کیے گئے۔ شیخ ہنکا نے غذاؤں اور کھانا پکانے کے طریقوں پر پہلی بار ایک انگریزی کتاب کا خوان نعمت کے عنوان سے ۱۲۵۲/۱۸۳۷ میں ترجمہ کیا۔

اس دور میں حتیٰ الف لیلی بھی دوبار فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اوحد بن احمد بلگرامی اور محمد باقر خراسانی نے الگ الگ یہ ترجمے کیے۔ محمد باقر خراسانی نے دو انگریز بھائیوں ہنری اور چارلز رسل کے لیے اپنا ترجمہ مکمل کیا اور اسی مناسبت سے اسے ترجمۂ ہنریہ کا نام دیا۔

حیدرآباد کے قاضی لشکر محمد کرامت علی دہلوی نے عہد غالب میں عتبی کی تاریخ یمینی کا بھی اصل عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ سبکتگین اور اس کے لڑکے سلطان محمود غزنوی کی تاریخ ہے۔ کرامت علی دہلوی نے اپنا ترجمہ حیدرآباد کے وزیراعظم اور شعرا و ادبا کے سرپرست مہاراجا چندو لعل شاداں کو پیش کیا۔

اس دور میں فارسی مکاتیب مرتب کیے گئے۔ تصوف و عرفان کے موضوع پر متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں۔ منظوم و منثور آثار کی شرحیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں لغت نویسی پر بھی بنیادی کام کیے گئے۔ ہفت قلزم، فرہنگ حسینی، غیاث اللغات، گنج اللغات، فرہنگ فرخی، نفائس اللغات، فرہنگ جعفری، تسہیل اللغات،

خزینۃ الامثال، بہار عجم، قاطع برہان وغیرہ فرہنگیں اس پچاس سالہ دور میں تالیف کی گئیں۔ غالب دہلوی کی قاطع برہان اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے۔ غالب نے اس میں برہان قاطع پر شدید تنقید کی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب مرحوم اور استاد گرامی جناب پروفیسر نذیر احمد صاحب نے غالب کی قاطع برہان میں وارد اشتباہات پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس میں خود غالب سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں، لیکن غالب سے پہلے کسی نے محض ایک لغت میں وارد غلطیوں کی نشاندہی کے لیے لغت مرتب کیا ہو، اس کا علم نہیں۔

اس دور کی ایک دوسری منفرد فرہنگ نخبۃ اللغات ہے۔ یہ ہندوستانی فارسی لغت ہے۔ جس میں عربی مترادفات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اسے سید احمد علی خان بدایونی کے لڑکے محمد علی ملقب بہ صدر امین نے ایک طویل علمی مشقت کے بعد مرتب کیا اور ۱۲۵۰/ ۵ - ۱۸۲۴ میں اسے رچرڈ کار گلین (RICHARD CARR GLYN) کو پیش کیا لغت ہندی، غرایب اللغات، تالیف شریف، مفردات ہندی وغیرہ نخبۃ اللغات کے مآخذ میں شامل ہیں۔

فارسی گرامر، مذہب، جغرافیا، موسیقی، طب وغیرہ کے موضوعات پر بھی اس دور میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں وجود میں آنے والے فارسی کے بیشتر آثار کا ابھی اس طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے جن کے حق دار ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے دانشور اس دور کے فارسی ادب کا توجہ سے مطالعہ اور اس کی علمی و ادبی حیثیت کا تعین کریں گے۔

حواشی :

۱۔ اس ضمن میں رک : نقد قاطع برہان، استاد نذیر احمد، ایوانِ غالب، نئی دہلی۔

۲۔ دیوانِ صہبائی، شامل کلیات، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۹۸ھ، ص ۲۵۸

۳۔ سخن شعرا، مولوی عبدالغفور خان نسّاخ، نول کشور، ۱۲۹۱ھ، ص ۹۷

۴۔ فارسی دیوان (مومن)، ذخیرۂ شیفتہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۱۳۶/ ۱۷۲۔ یہ دیوان غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے

۵۔ اس شاعر کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے رک : سید محمد عبداللہ کا مقالہ، اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۴۴ء، ص ۵ ـ ۸ اور فہرست اشپرنگر، ص ۲۲۷

۶۔ سخن شعرا، نساخ، ص ۵۰۵۔

۷۔ تاریخ پنجاب تحفۂ احباب، مطبع محمدی، لاہور، ۱۲۶۵ھ، ص ۹۰

۸۔ نواب صاحب نے فارسی شعرا کے دو تذکرے مرتب کیے۔ صبح وطن اور گلزار اعظم یہ دونوں بالترتیب ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۷۲ھ میں مدراس سے شائع ہو چکے ہیں۔

۹۔ بنیش نے اپنے تذکرہ اشارات بنیش (ترتیب و تحشیہ : ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ۱۹۷۳ء دہلی) اس مشاعرہ اور نواب صاحب کے شعرا کے ساتھ حسن سلوک کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ کلیات تراب، مطبع سرکاری ریاست رام پور، ص ۲۰

۱۱۔ صبح گلشن، علی حسن خاں، مطبع فیض شاہجہانی، ۱۲۹۵ھ، ص ۵۲۰

۱۲۔ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور (شمارہ ۲۳ ـ ۵۹) میں موجود ہے۔

۱۳۔ پیر فرخ بخش متخلص بہ فرحت (رک : پنجابی قصے فارسی زبان میں : مقالۂ پروفیسر باقر، اورینٹل کالج میگزین، ۴۳ ـ ۱۹۴۴ء، ص ۲۲) اور مولانا پیر محمد اودھی (کھرعماہ، مطبع بحر العلوم، ۱۲۹۵/ ۱۸۷۸) نے الگ الگ اسی صدی میں یہ داستان فارسی میں بیان کی ہے۔

۱۴۔ میر نصیر خاں جعفری نے یہ داستان اپنی مثنوی "میرزا صاحبان" میں بیان کی ہے، رک : تکملۂ

مقالات الشعرا، مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی تصحیح پیر حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۱۔

۱۵ہ پریاداس نے یہ داستان اپنی مثنوی کنورکام وکلام کام میں بیان کی ہے (مخطوطہ، لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری، شمارہ ۵۵۱۲ و ۸۹۱) اور چودھری کوڑامل کی مثنوی قصۂ کامروپ بھی اسی داستان پر مشتمل ہے (مخطوطہ، برٹش میوزیم، اگرتن ۱۰۲۶)۔

۱۶ہ مخطوطہ، پٹنا یونی ورسٹی لائبریری۔

۱۷ہ مثنوی ہیر رانجھا، نواب علی محمد خاں ولی لغاری، رک: مثنویات ہیر رانجھا، حافظ محمود شیرانی، سندی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۷ء۔

۱۸ہ ناصری محسن عبد الحمید نے داستانوں کے اس مجموعے کو ۱۲۵۴/ ۹ - ۱۸۳۸ء میں فارسی میں بیان کیا ہے۔ رک: فہرست مخطوطات کتاب خانۂ اکادمی جمہوریۂ آذربائیجان، باکو، ج ۱، ص ۴۱۸۔

۱۹ہ سداسکھ شایق نے اپنی مثنوی کان جود (مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، شمارہ ۵۷۲) اور سید امداد علی اور شیو سہائے کایتھ نے اس ہندوستانی داستان کو فارسی میں بیان کیا ہے (فہرست مخطوطات فارسی، برٹش میوزیم، ج ۳، ص ۱۰۰۶، شمارہ ۱۹۲۴ ہ)۔

۲۰ہ امامی نے رتن سین و پدماوتی عشقیہ داستان کو ۱۲۲۳/ ۱۴ — ۱۸۱۳ میں مثنوی بوستان سخن میں بیان کیا ہے (مخطوطہ، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، شمارہ ۳۰۸۵)۔

۲۱ہ اس داستان کا خطی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور، شمارہ ۸۷۱ - ۹۱ میں موجود ہے۔ غالباً صالح نے اس داستان کو سب سے پہلے فارسی میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد عطا محمد زیرک اور شیخ نظام الدین مسکین نے یہ داستان انیسویں صدی میں فارسی میں بیان کی ہے۔ رک: پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۹۵

۲۲ہ اس کے فارسی متن کا مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتہ (شمارہ ۲۵۹) میں موجود ہے۔

۲۳ہ مخطوطہ، پٹنا یونی ورسٹی لائبریری۔

۲۴ہ مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۱۹۳۱ میر حسن علی خاں تالپور نے یہ داستان سندھی زبان

میں ترجمہ کی ہے، رک: تکملۂ مقالات الشعرا، ص ۵۶۹

۲۵؎ رک: سندھ کے فارسی شعرا (انگریزی)، ڈاکٹر سدا رنگانی، ص ۲۲۲ – ۲۲۳

۲۶؎ تکملۂ مقالات الشعرا، ص ۵۷۰

۲۷؎ ایضاً، ص ۵۷۰

۲۸؎ ایضاً، ص ۵۷۱

۲۹؎ مخطوطہ، ذخیرۂ سبحان، آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۱۲۶

۳۰؎ اتھے، ج ۲، شمارہ ۳۰۰۹، اسٹوری، ص ۴۸۲

۳۱؎ نول کشور، چاپ سوم، ۱۸۰۷ء

۳۲؎ ریو، ج ۲، ص ۹۹۴، شمارہ ۱۸۹۱ OR

۳۳؎ خدابخش لائبریری، شمارہ ۶۲۸، اس کتاب کا پہلا حصہ ایران سے شائع ہوگیا ہے۔ اس میں مجلسی خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۳۴؎ مرآۃ الاحوال جہان نما، ورق ۱۰۴ – ب

۳۵؎ ریو، ج ۲، ص ۹۱۳، شمارہ ۱۸۲۰ OR

۳۶؎ ریو، ج ۳، ص ۱۰۲۶، اس کے علاوہ رک: اسٹوری، ص ۴۸۳، ریو، ج ۱، ص ۱۰۴۲

۳۷؎ مخطوطہ، کتاب خانۂ ملا فیروز، بمبئی، شمارہ ۱۰

۳۸؎ ریو، ج ۳، ص ۹۱۴، شمارہ ۱۶۹۸ OR

۳۹؎ نجم کے احوال زندگی اور علمی کارناموں کے لیے رک: اسٹوری، ص ۱۴۸، ریو، ج ۲، ص ۹۱۴، منظاہر الادیان، مخطوطہ، خدابخش لائبریری، شمارہ ۱۴۵۷، ورق ۶ – الف

۴۰؎ ذخیرۂ سلام، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، شمارہ ۲۸۰ – ۱۵۰، اسی کتاب کا ایک خطی نسخہ جو علی گڑھ کے نسخے سے اپنے مطالب و مشتملات کے لحاظ سے کسی حد تک مختلف ہے۔ نیشنل میوزیم میں بھی موجود ہے۔

۴۱؎ فراست نامہ، ورق ۳ – الف

۴۲؎ ایضاً، ورق ۹ – الف

۴۳ پنجابی ادبی اکادمی نے یہ کتاب دو جلدوں میں لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع کی ہے۔

۴۴ لالہ سوہن لال سوری (م: ۹ - ۱۲۶۸/۱۸۵۲) فرزند لالہ گنپت رائے پسر لالہ حکومت رائے رنجیت سنگھ کے دربار میں وکیل تھے۔ انھوں نے سکھوں اور رنجیت سنگھ کی تاریخ عمدۃ التواریخ تالیف کی ہے۔ رک: اسٹوری، ص ۶۸۱، مصنف کے لڑکے نے یہ کتاب ۱۸۸۴ میں شائع کی ہے۔

۴۵ عبرت نامہ، ص ۳

۴۶ ایضاً، ص ۳

۴۷ غلام محی الدین ملقب بہ بوٹی یا بوٹا شاہ علوی قادری نے یہ پنجاب کی تاریخ ۱۲۵۸/۱۸۴۲ میں تالیف کی۔ رک: ریو، ج ۳، ص ۹۵۳، شمارہ ۱۹۲۳ ۵ء۔ اس خطی نسخے کی خود مصنف نے ۱۲۶۵ھ میں تصحیح کی تھی۔

۴۸ عبرت نامہ، ص ۳ و ۴

۴۹ غالب کی کلیات میں شامل ہے۔ ایوان غالب نے بھی یہ کتاب شائع کی ہے۔

۵۰ ریو، ج ۳، ص ۹۰۰، شمارہ ۵۴/۱۷، اسٹوری، ص ۱۵۱، یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۲۳۹ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۵۱ ریو، ج ۳، شمارہ ۲۰۵۸ ۵ء

۵۲ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۷۶۷ - یہ کتاب ۱۳۲۳/۱۹۰۵ میں شائع ہو چکی ہے۔

۵۳ فہرست مخطوطات، آصفیہ لائبریری، ج ۱، ص ۲۲۲، شمارہ ۱۶۴، تذکرۂ نرل، حیدرآباد سے ۱۳۲۳/۶ - ۱۹۰۵ء میں غلام صمدانی خان کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۵۴ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۰۱

۵۵ مخطوطہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۴۰، اڈانبرا کی مخطوطات کی فہرست میں اسے سفرنامۂ میر عزت اللہ کا نام دیا گیا ہے، لیکن ریو، ج ۳، ص ۹۸۲ میں اسے مآثر عزت اللہ کے نام سے درج فہرست کیا ہے۔

۵۶ اس کا واحد خطی نسخہ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ (شمارہ ۶۲۱) میں موجود ہے۔ اس نسخے کی کتابت مصنف کے بھائی میرزا امیر علی شاہجہان آبادی نے خود مصنف کی خواہش پر کی تھی۔

۵۷ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۸۹

۵۸ ایضاً، ج ۲، شمارہ ۲۸۴۱

۵۹ مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۶۴۸، اس کتاب کا مخطوطہ احوال عمارات مستقر الخلافہ کے نام سے ایضاً، شمارہ ۳۱، میں موجود ہے۔

۶۰ ریو، ج ۲، شمارہ ۲۰۲۰ ص ۵۲

۶۱ اس کے دو خطی نسخے دہلی میں ہیں۔ ایک آرکائیوز، نئی دہلی اور دوسرا لال قلعے کے میوزیم میں۔ اس کے دوسرے نسخے دوسری لائبریریوں میں بھی موجود ہیں۔ اس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ راقم الحروف نے ایوان غالب سے شائع کیا ہے۔

۶۲ یہ تذکرہ ۶۹۲ اردو شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اسے سید عبدالقاسم معروف بہ حکیم قدرت اللہ قادری نے ۱۲۲۱/ ۷-۱۸۰۶ میں مکمل کیا۔ محمود شیرانی نے یہ تذکرہ لاہور سے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا ہے۔

۶۳ تالیف خلیفہ غلام محی الدین قریشی، ۱۲۲۲/ ۱۸۰۷ میں مکمل ہوا۔ ایک سو اردو اور فارسی شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ رک: اسپرنگر، ص ۱۸۷، مجلہ نگار، ۱۹۵۹ء، مقالہ پرفسور نثار احمد فاروقی

۶۴ ذوالفقار علی مست نے ۱۲۲- اردو فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۲۹/ ۱۴-۱۸۱۳ میں مکمل کیا۔ پروفیسر سید حسن، پٹنہ یونی ورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرسول خیام پور، تبریز یونی ورسٹی نے بھی یہ تذکرہ شائع کیا ہے۔

۶۵ میر محمد خان سرور نے ۹۹۶ اردو شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۱۹/ ۵-۱۸۰۴ میں مکمل کیا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اسے دہلی یونی ورسٹی سے شائع کیا ہے۔

۶۶ آقا محمد قلی خان متخلص بہ عشقی نے یہ تذکرہ ۱۳ رجب ۱۲۳۲/ ۱۸-۱۸۱۷ میں مکمل کیا۔ اس کا ایک مخطوطہ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی (شمارہ ۱۰۲) میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ تاجیکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

۶۷ سید مرتضیٰ بینش نے اس تذکرہ میں کرناٹک کے ۷۰ فارسی شعرا کے احوال درج کیے ہیں۔ ۱۲۶۵/ ۹ ــ ۱۸۴۸ میں مکمل ہوا۔ راقم حروف نے یہ تذکرہ شائع کر دیا ہے۔

۶۸ عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا، انجمن ترقی اردو سے شائع ہو چکے ہیں۔

۶۹ قدرت اللہ قدرت نے ۵۲۹ شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۵۸/ ۳ ــ ۱۸۴۲ میں مکمل کیا۔ یہ بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔

۷۰ غلام محمد غوث خان نواب کرناٹک (م: ۷ اکتوبر ۱۸۵۵ء) نے کرناٹک کے ۹۲ فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۵۸/ ۱۸۴۲ء میں مکمل کیا۔ یہ مدراس سے ۱۲۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔

۷۱ قاضی محمد صادق متخلص بہ اختر نے ۲۶۴ فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۶۹/ ۳ ــ ۱۸۵۲ میں مکمل کیا۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ راقم کا ایک مقالہ اس تذکرہ کے بارے میں غالب نامہ میں شائع ہوا ہے۔

۷۲ مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۶۷۹

۷۳ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۷۷

۷۴ خدا بخش لائبریری، شمارہ ۱۴۱۵

۷۵ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۶۰

۷۶ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۲۸

۷۷ ریو، ج ۳، ص ۹۹۶

۷۸ خدا بخش لائبریری، شمارہ ۲۵۳۱

۷۹ بوڈلین لائبریری، شمارہ ۲۵۳۱

۸۰ ریو، ج ۲، ص ۹۰۰، شمارہ ۱۸۸۸

۸۱ تالیف نواب غازی الدین خان حیدر، ۱۲۳۴/ ۱۸۱۸ میں مکمل ہوئی۔ لکھنؤ سے ۱۲۳۷ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۸۲ سید غلام حسین شیخ فرزند فتح علی رضوی کی تالیف ہے۔ رک: اسٹے، ص ۳۵۴، شمارہ ۲۵۱۷

۸۳ء محمد غیاث الدین کی یہ معروف لغت ۱۲۴۲/ ۷ - ۱۸۲۶ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور بار ہا ایران و ہند سے شائع ہوئی ہے۔

۸۴ء ریو، ج ۳، ص ۹۹۷، شمارہ ۲۰۱۲

۸۵ء رک : مقدمۂ آصف اللغات، ج ۱

۸۶ء نول کشور، لکھنؤ، جولائی ۱۸۹۷ء۔

۸۷ء رک : فرہنگ نظام، ج ۵

۸۸ء آصفیہ لائبریری، حیدرآباد، شمارہ ۵۸۷

۸۹ء مطبع مصطفائی محمد خان

۹۰ء ذخیرۂ بوبار، کلکتہ، شمارہ ۵۳۰، مطبع غوثیہ مدراس سے شائع ہو چکی ہے۔

۹۱ء قاضی عبدالودود نے اس کی تصحیح کی اور ایوانِ غالب سے شائع کی ہے۔

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی چند نئی مطبوعات

دیوانِ غالب (ہندی) دوسرا ایڈیشن	۶۰/=
انتخاب کلام غالب (انگریزی) یعقوب مرزا	۹۰/=
غالب کاویہ کا اودھی روپ (ہندی) ترجمہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی	۴۰/=
گفتۂ غالب ڈاکٹر محمد سیادت نقوی	۶۰/=

جناب ضیاء الدّین اصلاحی

مالک رام اور بعض مسائلِ غالب کی تحقیق

جناب مالک رام صاحب اُردو کے مشہور مصنف و محقق اور غالب والا کلام کے بڑے عارف و شیدائی ہیں، تحقیق کا میدان ان کی خاص جولان گاہ رہا ہے، اس میں ان کے کارنامے امتیازی اور بہت نمایاں ہیں، ان کا شمار تحقیق کے اساطین میں ہوتا ہے، جناب علی جواد زیدی لکھتے ہیں :

" جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آتے ہیں، قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی ادیب[۱] "

تحقیق میں ان کی عظمت و بلند پائیگی کا اعتراف اُردو کے دوسرے مشہور ادیبوں اور محققوں نے بھی کیا ہے۔

مالک رام کے تحقیقی کاموں کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے لیکن غالب ان کی تلاش و جستجو اور تحقیق و کاوش کا اہم موضوع ہے اور اس میں انھوں نے جو سرمایۂ یادگار چھوڑا ہے اسے ہمیشہ قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور غالب کا کوئی طالب علم مالک رام کے اکتسابات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ غالب پر ان کے کاموں میں بڑی وُسعت

اور رنگا رنگی ہے یہاں ہم غالب کے متعلق ان کی تلاش و تحقیق کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ میاں نظیر اکبر آبادی سے تلمذ کا مسئلہ ـــ مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" میں نظیر اکبر آبادی سے غالب کی شاگردی کو صحیح نہیں مانا ہے، ان کی تحقیق میں یہ نہ روایۃً ثابت ہے اور نہ درایۃً۔ روایۃً اس بنا پر کہ مرزا کے ہم عصر تذکرہ نگار خوب چند ذکا (متوفی ۱۸۴۶ء) نے اپنے تذکرۂ "عیار الشعرا" میں غالب کی تعلیم سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ "شاگرد مولوی محمد معظم" اُن کے خیال میں اگر غالب نظیر کے شاگرد ہوتے تو ذکا ان کا ذکر ضرور کرتے۔ درایۃً اس لیے کہ سب سے پہلے حکیم غلام قطب الدین باطن کے تذکرۂ گلستان بے خزاں" معروف بہ "نغمۂ عندلیب" میں نظیر کی شاگردی کا ذکر ملتا ہے، ان کی اتباع میں پہلے حسرت موہانی نے اور پھر دبے لفظوں میں شیخ محمد اکرام نے غالب کو نظیر کا شاگرد قرار دیا۔

مالک رام صاحب کہتے ہیں کہ باطن کا تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مشہور تذکرۂ "گلشن بے خار" کا جواب ہے، شیفتہ نے مومن، آزردہ، غالب اور دوسرے ہم عصر شعرا کی بہت تعریف کی تھی مگر نظیر کا ذکر جس طرح کیا تھا وہ ان کے دوستوں اور شاگردوں کو بہت ناگوار گزرا، باطن پہلے نظیر سے اصلاح لیتے تھے، ان کے فوت ہونے کے بعد ان کے جواں سال صاحبزادے گلزار علی اسیر سے مشورہ کرتے تھے، انہی کے کہنے سے باطن نے اپنا تذکرہ لکھا جس میں دہلوی شعرا کی دل کھول کر مخالفت کی اور غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا، ان کے الفاظ اور تیور غمازی کر رہے ہیں کہ یہ دعوی محض شیفتہ کی مخالفت اور نظیر کے کلام پر ان کے اعتراض کے جواب میں وضع کیا گیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں[۲]:

> "... اُستادان باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعرا (نظیر اکبر آبادی) جو بے نظیر روزگار تھے، ان سے تعلیم پائی، ایام صبا سے بہ برکت انفاس متبرکہ ان اُستادوں کے یہ مرتبہ علم پہنچے۔ تب ان کی

فکر رسا نے یہ صورت دکھائی، کیوں نہ خوش گو ہوں جن کے استاد دو ہوں،
چوں کہ وہ اُستاد مر گئے، یہ جدِّ دہلی (آگرہ) سے ادھر گئے، اب خواہ شاگردی
سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔"

مالک رام صاحب کو مولوی معظّم کی تاریخ وفات کی تحقیق نہیں ہو سکی لیکن وہ نظیر کی رحلت کا سال ۱۸۳۰ء بتاتے ہیں اور غالب اس سے بہت پہلے ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ دہلی چلے آئے تھے اس لیے ان کی وفات کے بعد دہلی آنے کی بات غلط ہے، پھر آخری الفاظ "اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں" باطن کے دل کا چور ہے جو ان سے چھپ نہ سکا، صاف ظاہر ہے کہ انھیں خود اپنے کہنے کا یقین نہیں، اگر نظیر کی شاگردی مسلم تھی تو غالب اِنکار کیوں کرنے لگے تھے۔

مالک رام کو اصولاً نظیر کی شاگردی پر اعتراض نہیں ہے کیوں کہ مرزا کے بچپن میں آگرے میں نظیر کا مکتب تھا اور مولانا حالی فرماتے ہیں[۳] "اگر بالفرض بچپن میں غالب نے نظیر کے مکتب میں تعلیم پائی ہو تو کوئی تعجب بھی نہیں، اس سے نظیر کی زیادہ عزت ہوتی ہے اور میرزا کی عزت کم نہیں ہوتی۔"

۲۔ غالب کے بارے میں میر صاحب کی پیش گوئی: مالک رام صاحب نے ذکر غالب میں غالب کے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے کے ثبوت میں مولانا حالی کے حوالہ سے میر تقی میر کی یہ پیش گوئی لکھی ہے[۴]۔

"اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے
رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"

پھر مولانا حالی ہی کے حوالے سے بتایا ہے کہ مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں نامیؔ دہلوی (شاگرد میر مستحسن خلیق و میر تقی میر) نے غالب کی غزل میر کو دکھائی تو انھوں نے مندرجہ بالا رائے ظاہر کی۔

حاشیے میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ مولانا غلام رسول مہر[۵] نے اس روایت کی عدم صحت کے دو اسباب بیان کیے ہیں۔

۱۔ اس کم عمری میں میرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے ؟ اور اسے وہاں لے کون گیا ؟ اور اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی ؟

۲۔ میر عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے، اس لیے وارفتگی حواس اور ہجوم امراض میں وہ کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

مالک رام صاحب نے پہلے مولانا مہر سے یہ سوال کیا ہے کہ یہ کس نے کہا ہے کہ کلام ضرور آگرے سے گیا، ان کی تحقیق میں غالب سات برس کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے، ان کے تعلقات نواب احمد بخش خاں کے خاندان سے تھے اور وہ لازماً انہی کے یہاں قیام کرتے ہوں گے، نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خاں معروف بہت اچھے شاعر تھے، ناممکن ہے کہ انھوں نے میرزا کا یہ ابتدائی کلام نہ سنا ہو، نواب حسام الدین حیدر خاں نامی اور معروف کے گہرے دوستانہ تعلقات مہر صاحب کو بھی تسلیم ہیں، نامی نے میرزا کا کلام یہیں دہلی میں خود میرزا سے لیا یا معروف سے اور اس کی ندرت و غرابت کی وجہ سے اسے لے جا کے اپنے اُستاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک ۱۲، ۱۳ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے۔

دوسرے سبب کے متعلق مالک رام فرماتے ہیں کہ میر پریشاں حال اور بیمار سہی لیکن شعر سُن سکتے تھے اور اُس کے متعلق رائے تو ظاہر ہی کر سکتے تھے، وہ کوئی تنقیدی مضمون تو لکھ نہیں رہے تھے کہ بہت زیادہ یک سوئی اور اطمینان کی ضرورت ہوتی۔ پھر جو فقرہ میر صاحب نے کہا مالک رام کی نظر میں اس پر میر کی مخصوص چھاپ لگی ہوئی ہے۔

۳۔ غالب کی مشکل گوئی اور سہل گوئی :

مالک رام صاحب اس نظریے کو غلط بتلاتے ہیں کہ آغاز میں انھوں نے بیدل کی تقلید میں مشکل خیالات باندھے اور زبان بھی مشکل اختیار کی اور انھیں اپنی اس غلط روش کا احساس نہیں تھا یا شاید وہ آسان زبان لکھنے پر قادر نہیں تھے، رفتہ رفتہ آخری دور میں انھوں نے میر کے زیر اثر آسان گوئی اختیار کی۔

مالک رام صاحب کی تحقیق میں ۳۰ سال کی عمر یعنی ۱۸۲۸ء تک غالب کے جو چار مجموعے مرتب ہو چکے تھے ان میں غالب کی وہ سب آسان غزلیں موجود ہیں جن کی بنا پر انھیں میر کے زیرِ اثر کہا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا احساس غالب کو مرورِ زمانہ سے ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں مرزا مشکل نویسی سے تائب ہو گئے اور یہ سب کچھ میر سے ان کی گرویدگی کے باعث ہوا۔

مالک رام صاحب اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے غالب کی زیادہ مشہور آسان غزلوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں[۵۹] اور یہ سب غزلیں انہی چاروں مجموعوں میں شامل ہیں جو غالب کی ۳۰ سال کی عمر تک مرتب ہو چکے تھے، ان آسان غزلوں کا جائزہ لے کر وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اتنی ساری غزلوں کو دیکھتے ہوئے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ شروع میں آسان زبان لکھنے سے معذور تھے جب کہ ان غزلوں میں سے متعدد نسخۂ حمیدیہ کی تاریخ کتابت ۱۸۲۱ء سے پہلے کی ہیں اور اس وقت ان کی عمر بہ مشکل ۲۴ برس کی تھی اور بہت بڑی تعداد ۱۸۲۶ء سے قبل کی ہے جو نسخۂ شیرانی کی آخری حد ہے۔

اس چھان بین سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ غالب کی ابتدائی مشکل گوئی پسند کی نہیں بلکہ مجبوری کی تھی۔ شعر گوئی کے آغاز میں وہ بیدل، شوکت بخاری اور اسیر کی دُور از کار خیالی شاعری اور تشبیہات و استعارات سے گراں بار طرزِ سخن سے گویا چکا چوند ہو گئے، ان اصحاب کی تقلید میں وہ بھی خیالی مضامین لکھنے لگے اور انھیں ادا کرنے کو لامحالہ غالب کو مشکل زبان لکھنا پڑی لیکن اسی زمانے میں انھوں نے آسان غزلیں بھی لکھیں اور یہ وہ آخر تک لکھتے رہے، غرض نہ انھوں نے مشکل زبان بیدل کے زیرِ اثر لکھی، نہ آسان میر کے زیرِ اثر، انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ان دونوں اثرات سے آزاد، حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت مشکل بھی لکھ سکتے تھے اور آسان بھی۔

۴۔ غالب کے اُردو دیوان کا انتخاب

مالک رام صاحب کے خیال میں غالب نے اپنے اُردو دیوان کا انتخاب خود ہی

کیا تھا مگر مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں جو کچھ لکھا ہے[۸]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا دیوان بہت بڑا تھا، مولوی فضلِ حق فاضل بے عدیل، مرزا قتیل کے شاگرد مرزا خاں عرف مرزا خانی نے جو نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے، یہ انتخاب کیا تھا۔ وہ دونوں مرزا غالب کے دوست تھے، انھوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے، اس پر مرزا نے انتخاب کے لیے دیوان ان کے حوالہ کردیا، اب یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

مالک رام صاحب نے اس کو آزاد کی افسانہ طرازی قرار دیتے ہوئے اس کی اصل حقیقت نمایاں کردی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس سے آزاد کا اصل مقصد غالب کو نااہل اور کج فہم ثابت کرنا ہے کیوں کہ مولوی فضل حق فاضل دینیات اور امام معقولات تھے یعنی وہ عالم ہوں گے۔ انھیں شعر و سخن سے کیا واسطہ؛ رہے مرزا خانی تو وہ نظم و نثر فارسی خوب لکھتے ہوں گے، انھیں اُردو سے کیا سروکار؟ اور اس پر وہ ٹھہرے قتیل کے شاگرد جن کے متعلق غالب کی رائے معلوم ہے اور خود مرزا خانی کی بھی سخن فہمی و سخن سنجی کی جو حقیقت آزاد کے نزدیک ہے، اسے انھوں نے ایک اور موقع پر بیان کیا ہے[۹]۔ غرض مالک رام کے خیال میں آزاد کے پیشِ نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ غالب کے دیوان کا انتخاب ایسے لوگوں نے کیا ہے جن کو اُردو شعر و سخن کا کوئی مذاق نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ یہ دیوان جسے آج ہم اتنی اہمیت دیتے ہیں دراصل دوسروں کا مرہونِ منت ہے، اس بنا پر مالک رام کے نزدیک یہ افسانہ محض غالب کو مطعون کرنے کے لیے گڑھا گیا تھا۔

مالک رام کی تحقیق میں غالب ساری عمر اپنے کلام میں سے خود ہی ترمیم و اضافے کرتے رہے، انھوں نے صحیح معنوں میں انتخاب کا کام پہلی مرتبہ کلکتے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر گلِ رعنا کے نام سے کیا، اس کے دیکھنے کے بعد تو کسی شبہے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہ جاتی کہ متداول دیوان کا انتخاب بھی خود انھیں کا کیا ہوا ہے اور اس میں کسی اور کا دخل نہیں تھا۔ چند مستثنیات سے قطع نظر گل رعنا کا جملہ انتخاب جوں کا توں متداول دیوان میں شامل ہے۔

۵۔ لطائفِ غیبی کا مصنف کون ہے؟

۱۸۶۵ء میں سید سعادت علی کی محرقِ قاطعِ برہان کے جواب میں ایک کتاب لطائفِ غیبی کے نام سے لکھی گئی، اس پر مصنف کا نام میاں دادخاں سیاح لکھا ہوا ہے مگر مالک رام صاحب کی تحقیق میں یہ کتاب خود غالب نے لطائفِ غیبی کے نام سے لکھی تھی۔ وہ اس کے حسبِ ذیل داخلی و خارجی دلائل پر بیان کرتے ہیں۔

۱۔ مرزا غالب میاں دادخاں سیاح کو خط لکھتے ہیں:۔

"تمھیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے، تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو، میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی، لطائفِ غیبی نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں[۱۰]۔"

اس کے ساتھ لطائفِ غیبی کا آغاز ملاحظہ ہو:۔

"سیاحِ بحر و بر ہیچ مداں، بے ہنر، سیف الحق میاں دادخاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے[۱۱]۔"

مالک رام کا استدلال یہ ہے کہ خطاب سیف الحق مرزا کا دیا ہوا ہے جس کو لطائفِ غیبی کے دیباچہ میں لکھ کر انھوں نے سیاح کو اطلاع دی تھی۔ اگر کتاب سیاح کی لکھی ہوتی تو وہ دیباچہ میں سیف الحق کیسے لکھتے انھیں اس کی اطلاع کیوں دیتے۔ اس سے ظاہر ہے ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے کتاب لکھ کر اسے ان سے منسوب کر کے گویا انھیں اطلاع دی میرزا کے خط کا مدعا یہ ہے کہ کلام میرا ہوگا مگر وہ تمھارے نام سے لکھا اور شائع کیا جائے گا، میں اپنی تحریر اپنے نام سے شائع نہیں کروں گا، میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔

۲۔ لطائفِ غیبی کی طباعت کے زمانے میں مرزا نے قتیل کے کلام پر اعتراض لکھ کر سیاح کے نام سے ایک اخبار اشرف الاخبار میں چھپوا دیا اور پھر وہ اخبار سیاح کے پاس بھیجا جس کی اطلاع ایک تحریر کے ذریعے ان کو دی، مالک رام یہ تحریر[۱۲] نقل کر کے بتاتے ہیں کہ اس سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ مرزا کے نطق کی تلوار سیاح کے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔

۳۔ لطائفِ غیبی میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اگر یہ سیاح کی تصنیف ہوتی تو ان کو جو نسخے بھیجے گئے تھے انھیں وہ خود درست کر لیتے۔ مرزا غالب کو تصحیح شدہ بھیجنے اور اس کی انھیں خبر دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی، مالک رام صاحب غالب کے خط[۱۳] کا متعلقہ حصہ نقل کر کے بتاتے ہیں کہ "اس سے عیاں ہے کہ کتاب مرزا نے لکھی تھی اور اب وہ اس کی غلطیاں درست کر کے سیاح کو بھیج رہے ہیں۔"

۴۔ مالک رام صاحب نے لطائفِ غیبی کے دیباچے کا یہ آخری فقرہ نقل کیا[۱۴] ہے کہ "مجھ کو تو حمیت اور رعایت حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے بیس[۱۶] لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا لطائف غیبی نام رکھا ؎

در پسِ آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

مالک رام صاحب کے نزدیک اس سے ظاہر ہے کہ سیاح تو در پس آئینہ طوطی صفت بیٹھے ہیں" اُستادِ ازل" (غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ دُہرا رہے ہیں اور کتاب کا نام لطائف غیبی بجائے خود غمازی کر رہا ہے کہ ؏

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

۵۔ سب سے بڑی داخلی شہادت لطائفِ غیبی کے اسلوب بیان اور طرزِ تحریر کو بتایا ہے، وہ سیاح کی کتاب" سیر سیاح" کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس میں صرف پانچ چھ صفحے نثر کے ہیں لیکن شروع سے آخر تک مسجع و مقفیٰ فقرے ہیں اور تصنع و آورد سے کوئی سطر خالی نہیں، اس میں اور لطائفِ غیبی میں ان کے نزدیک کوئی نسبت ہی نہیں ہے، جس میں بے ساختگی اور آمد کے علاوہ ظرافت اور بذلہ سنجی فقرے فقرے سے عیاں ہے جو غالب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان وجوہ سے وہ اسے غالب ہی کی تصنیف بتلاتے ہیں اور میاں داد خاں سیاح کی حیثیت جامع سے زیادہ نہیں قرار دیتے جیسا کہ درفش کاویانی کے آخر میں سیاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامع لطائف غیبی"[۱۵] ہے۔

۶۔ ہندوستان کے فارسی دانوں کے متعلق غالب کے خیالات کا جائزہ:

میرزا غالب ہندوستان کے فارسی دانوں، ادیبوں اور شاعروں کو نہ اہمیت دیتے تھے اور نہ مستند خیال کرتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ہندوستان کے بعض مشہور فارسی لکھنے والوں کے نام گنانے کے بعد لکھا ہے کہ ان میں سے میرزا حضرت امیر خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے، انھوں نے اپنے رقعات میں ہر جگہ یہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان کی فارسی کو معیاری سمجھا جائے۔[۳۱]

چونکہ غالب کے اس اعتراض کی نوعیت کو سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اس لیے مالک رام صاحب نے اس پر بہت تحقیق سے بحث کی ہے، وہ میرزا کے اعتراض کی اصل حقیقت ظاہر کرنے سے پہلے کچھ اصولی مقدمات بیان کرتے ہیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ جو علوم سماعت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں قیاس سے کام نہیں چلتا، زبان کا شمار ایسے ہی علوم میں ہے، یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے یعنی پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی تقلید کرتے ہیں، اس لیے اگر کوئی شخص نئے الفاظ اور محاورے گڑھنا اور لکھنا شروع کر دے تو ان کو قبول عام اسی وقت ملے گا جب جمہور کی تائید کی سند اسے حاصل ہو جائے، اس کے بغیر وہ ٹکسال باہر ہوں گے اور زبان کا جز نہیں بن سکیں گے، مقبولیت اور تائید سماعی اصول پر پورے اُترنے کے بعد ہی ملتی ہے۔

۲۔ جس ملک میں کوئی خاص زبان بولی جاتی ہے وہ اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان کہلاتی ہے، اسی لیے وہاں کے لوگ اہلِ زبان کہلاتے ہیں کہ بچپن ہی سے اسے بڑے بوڑھوں سے سُنتے چلے آئے ہیں، اس لیے زبان کے اسرار و رموز سے جس طرح وہ واقف ہوتے ہیں، دوسرے ملک کے باشندے نہیں واقف ہوتے،، ہاں مشق و محنت سے اجنبی ملکوں کے لوگ بھی قواعد پر عبور حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی رو سے زبان صحیح لکھ سکتے ہیں، ایسی صورت میں ان کا درجہ زباں داں کا تو ہو سکتا ہے لیکن اہلِ زبان کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد بعد میں۔ زبان و بیان کے روزمرے میں جو بے شمار نزاکتیں اور باریکیاں ہوتی ہیں وہ نہ تحریر میں آسکتی ہیں اور نہ وہ کسی قاعدے کی پابند ہوتی ہیں، ان کا

تعلق سماعت و وجدان سے ہوتا ہے جو کسی قاعدے اور کتاب میں نہیں ملیں گی۔

۳۔ زبان کو کتابوں کی مدد سے حاصل کرنے والے اجنبی شخص کی تحریر میں وہ سادگی، آمد، بے ساختگی اور شیرینی نہیں ہوگی جو کسی اہلِ زبان کی تحریر میں ملے گی، کیوں کہ اس کا علم خارجی ہوتا ہے، داخلی نہیں ہوتا اور اہلِ زبان ہوش سنبھالنے کے وقت ہی سے زبان سنتا اور بولتا ہے، اسے لفظوں کی تلاش میں کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کے برعکس زباں داں کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں الفاظ ڈھونڈھنا پڑیں گے اس وجہ سے خواہی نخواہی اس کی تحریر و بیان میں تصنع اور آورد آجائے گی۔

۴۔ جب کسی لفظ یا محاورے کی غلطی و صحت کا مسئلہ ہوگا تو فیصلہ اہلِ زبان کی سند سے ہوگا، اس کے بارے میں کسی بڑے سے بڑے اجنبی شخص کا کلام بھی مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔

ان چار اصولی مقدمات کو مدِنظر رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کو ہندوستانی فارسی لکھنے والوں پر اعتراض کیا تھا؟ غالب ان اصحاب کو عالم اور فارسی جاننے والا ماننے کے باوجود کہتے ہیں کہ ان کا مقابلہ اہلِ زبان سے کیا؟ اس سلسلہ میں مالک رام صاحب غالب کی مختلف تحریروں کے حوالے دے کر یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ کیوں سب مشہور ہندوستانی فارسی نویسوں کو سند نہیں مانتے؟ حقیقت یہ ہے کہ صحیح زبان لکھ لینا اور بات ہے اور طرزِ گفتار کا اہلِ زبان سا ہو جانا اور بات ہے۔ شعر لکھ لینا کچھ مشکل نہیں لیکن زبان کا سند ہونا اور اس میں اہلِ زبان کی سی گھلاوٹ ہونا اور بات ہے، اس میں کوئی قیاس اور کوشش مفید نہیں ہو سکتی۔

میرزا غالب کے نزدیک محض زبان کا درست اور الفاظ کا با محل اور با موقع ہونا کافی نہیں، طرزِ گفتار کا اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے کا سا ہونا شرط ہے اور یہ چیز ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی، درست زبان اور با محل الفاظ تو ہر وہ شخص لکھ سکتا ہے جس نے کسی زبان کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے قواعد پر حاوی ہو گیا ہے، مالک رام صاحب اس کی مثال میں ہندوستان کے انگریزی لکھنے والوں کو پیش کرتے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر

نگریزی کو انگریز خاطر میں نہیں لاتے۔

مالک رام صاحب کے نزدیک غالب کا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان کے فارسی نویسوں کی زبان میں فارسیت نہیں یا ایرانیوں کی سی ادا نہیں۔ ان کی زبان درست ہے، کلام موزوں ہے، غلط اور قابلِ اصلاح نہیں ہے تاہم اس کے باوجود اس میں کسی چیز کی کمی پائیں گے کیوں کہ " وراے شاعری چیزے دگر ہست" اور یہ چیزے دگر صرف اہلِ زبان کے حصے میں آتی ہے[۱۸]۔

۷۔ قتیل کے وطن کے متعلق غالب کا بیان:

غالب نے قتیل کو فرید آبادی کہا ہے، مالک رام صاحب نے اس کی تصدیق کے لیے تحقیق شروع کی اور کئی تذکروں کو کھنگالا تو مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے ان کو جو کچھ ہاتھ لگا اسے فسانہ غالب کے ایک مضمون "قتیل پنجابی الاصل تھا" میں بیان کیا ہے، اس مضمون کا مستفاد یہ ہے۔

مصحفی نے عقد ثریا[۱۹] میں قتیل کے بزرگوں کا تعلق قوم کھتری بھنڈاری سے بتایا ہے، نگار کے مصحفی نمبر کے ایک مضمون میں ان کا وطن بٹالہ بتایا گیا ہے، مالک رام صاحب نے اس کو پنجاب کے ضلع گورداس پور کا ایک قصبہ اور ریلوے جنکشن لکھا ہے جو امرتسر سے پٹھان کوٹ جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے، یہاں کا بھنڈاری خاندان بہت قدیم اور علم دوست ہے، قتیل اسی کے ایک فرد تھے، مالک رام صاحب کو اسی خانوادہ کے ایک شخص راے بھوانی سنگھ سے قتیل کا جو شجرۂ نسب ملا ہے اسے نقل کرکے انھوں نے بتایا ہے کہ قتیل کا خاندان ابتدا میں بٹالہ ہی میں آباد تھا اور بعد میں ترک سکونت کرکے لکھنؤ چلا گیا۔ اسد علی انوری کے بیان کے بموجب اس خاندان کے افراد فرید آباد میں موجود ہیں۔

راے بھوانی سنگھ کے مطابق قتیل کی پیدائش کے بعد ان کے دادا راے لعل جی مل نے بٹالے سے ترک سکونت کیا تھا لیکن آغا حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی نے اپنے ضخیم تذکرۂ نشترِ عشق میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ پروفیسر مختار الدین احمد[۱۹] نے دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کے جد سوم صورت سنگھ باغیت چلے

آئے اور یہیں ان کے باپ دادا کی ولادت ہوئی، دادا کی وفات کے بعد والد ڈاسنہ آئے جو دہلی سے ۱۰ کوس کے فاصلہ پر ایک چھوٹا قصبہ ہے پھر ان کو نواب ہدایت علی خاں نے اپنے پاس بلایا، اس طرح قتیل کے والد درگاہی مل کبھی ڈاسنہ اور کبھی نواب صاحب کے یہاں رہتے تھے اور قتیل کی ولادت شاہجہاں آباد میں ہوئی۔

مالک رام صاحب عاشقی کے بیان کردہ معلومات کو زیادہ لائق اعتماد سمجھتے ہیں کیوں کہ قتیل سے ان کے مراسم اور خط کتابت تھی، اس کے مقابلے میں ان کے نزدیک رائے بھوانی سنگھ کے اخذ کردہ نتائج درست نہیں۔

پروفیسر مختارالدین احمد نے قتیل کے فریدآبادی ہونے سے انکار کیا ہے اور مختلف مآخذ سے اسے دہلوی قرار دیا ہے لیکن مالک رام صاحب کے خیال میں ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، اس کی مزید توضیح اس طرح کی ہے۔

۱. سید ہاشمی فریدآبادی نے لکھا ہے[20] "اس زمانے میں فریدآباد کو دلّی کے مضافات میں ہونے کے باعث دلّی ہی کا ایک حصہ اور محلہ شمار کیا جاتا تھا"

۲. انشا کی دریائے لطافت کی تصنیف میں خود قتیل ان کے شریک تھے، اس میں فریدآباد کو دلّی کے بازاروں اور محلوں میں شمار کیا ہے[21]۔

ان وجوہ سے مالک رام کو خیال ہوتا ہے کہ قتیل فریدآباد میں رہتے تھے اور مضافات شہر میں ہونے کے باعث دہلوی کہلائے البتہ غالب نے فریدآبادی کہہ کر ان کی تضحیک اور ثابت کرنی چاہی ہے کہ قتیل دہلوی نہیں ایک بیرونی بستی کا رہنے والا ہے اس لیے غیر مستند ہے۔

۹. میرزا یوسف کی وفات کیسے ہوئی؟

مالک رام صاحب غالب کی طرح متعلقاتِ غالب میں بھی وسیع النظر تھے جس کا ثبوت ان کی تصنیف تلامذہ غالب اور فسانۂ غالب کے متعدد تحقیقی مضامین ہیں، فسانۂ غالب میں ایک پُر از معلومات مضمون میرزا یوسف پر ہے جو غالب کے بھائی اور ان سے دو برس چھوٹے تھے، وہ ۲۵ ـ ۳۰ سال کی عمر میں مجنون ہو گئے تھے اور تاوقت انتقال مجنون

رہے، مالک رام نے ان کی وفات کے سبب کے متعلق دو متضاد روایتیں نقل کر کے ان میں صحیح کی نشاندہی کی ہے۔

پہلی روایت[۲۱] خود غالب کی ہے جس کا مستفاد یہ ہے کہ میرزا یوسف کا انتقال بعارضۂ بخار ہوا، اس کے برخلاف لوہارو خاندان کی روایات کے مطابق وہ انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے تھے۔

مالک رام صاحب موخرالذکر روایت کو صحیح مانتے ہیں، اس کے لیے انھوں نے جو مقدمات ترتیب دیے ہیں، ان سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ روایت جن دو اشخاص سے مروی ہے، اس اعتبار سے قوی اور اہم ہیں کہ وہ دونوں لوہارو خاندان کے افراد ہیں اس لیے اس کی روایات سے بہ خوبی واقف اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات کے عینی شاہد تھے، چنانچہ مرزا معین الدین حسن خاں نے غدر کے حالات پر مشتمل "غدنگ نظر" کے نام سے کتاب لکھی تھی، مالک رام صاحب اس کے حوالے[۲۲] سے بتاتے ہیں کہ مرزا معین الدین حسن خاں کے نزدیک میرزا یوسف کا انتقال بخار سے نہیں ہوا جیسا کہ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے بلکہ وہ انگریز کی گولی سے جاں بحق ہوئے، یہی بات بگا بیگم نے بھی کہی ہے، اگرچہ انھوں نے تنی صراحت نہیں کی ہے۔ تاہم وہ جو یہ کہتی[۲۳] ہیں کہ "سرس کی گلی میں مارے گئے" تو اس کی س کے علاوہ اور کوئی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

اس طرح ان کی تحقیق میں غالب نے جان بوجھ کر حقیقت کے خلاف لکھا اصلی بات وہی ہے جو معین الدین حسن خاں اور بگا بیگم نے کہی کیوں کہ دستنبو نہ غدر کی تاریخ ہے اور نہ میرزا کا روزنامچہ، اس کتاب میں جستہ جستہ وہ واقعات لکھے ہیں جو انھیں خود پیش آئے یا دوسروں سے سُنے، اسے ان کو "اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ[۲۵]" بنانے کا خیال تھا اس لیے اس میں وہ کوئی ایسی بات نہیں لکھ سکتے تھے جو ان کے انگریز ممدوحین کی طبع نازک پر گراں گزرتی، ان کو اس کی طباعت میں اس لیے عجلت تھی کہ وہ اس کو نواب گورنر جنرل بہادر کو نذر کرنا چاہتے تھے، جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ غدر کے حالات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مطبع والے اس کی اشاعت میں پس و پیش کر رہے تھے تو ان کے اطمینان

کے لیے کہتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، میں تو کتاب کو انگریز کو پیش کرنا چاہتا ہوں، ایسی صورت میں اس میں ان کے خلاف کسی قسم کا مواد کیسے شامل کر سکتا ہوں[۲۱]۔

مالک رام صاحب یہ بھی بتلاتے ہیں کہ خاندانی روایات بہت سخت جان ہوتی ہیں، یہ سینہ بہ سینہ صدیوں تک زندہ رہتی ہیں اور یہاں تو بھولنے کا سوال ہی نہیں، دونوں راوی معین الدین حسن خاں اور بگا بیگم اس واقعے کے وقت موجود تھے، معین الدین حسن خاں عاقل و بالغ تھے، بگا بیگم کی عمر چھ سات برس کی تھی انھوں نے یقیناً یہ بات گھر ہی میں سنی ہوگی، اس لیے ان دونوں شہادتوں پر شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ میرزا غالب نے مصلحۃً حقیقت پر پردہ ڈالا اور یہ نہ لکھا کہ وہ انگریز کے ہاتھ سے مارے گئے تاکہ کہیں وہ اس سے ناراض نہ ہوجائیں۔

۹۔ غالب پر سکہ کا الزام

مالک رام صاحب نے غالب کی طرف منسوب سکہ اشعار کے الزام کا تذکرہ ذکر غالب اور فسانۂ غالب دونوں میں کیا ہے۔ لیکن فسانۂ غالب میں زیادہ تفصیل ہے۔ اسی کے حوالے سے یہاں گفتگو کی جاتی ہے۔

مرزا غالب پر الزام یہ تھا کہ جب باغیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا تو انھوں نے ان کے لیے یہ سکہ کہہ دیا تھا:

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مالک رام صاحب نے اس سلسلے کی تمام ضروری تفصیل مستند حوالوں سے پیش کی ہے، پہلے ۵۸ ــ ۱۸۵۷ء کے لکھے ہوئے تفتہ کے نام کے ان کے خطوط کے اقتباسات دیے ہیں[۲۲]، جن میں اس پر مسرت و اطمینان ظاہر کیا ہے کہ ان کے خلاف کوئی فرد جرم نہیں، لیکن ان کا یہ خیال غلط نکلا جس کے ثبوت میں جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام سید مرزا حسین[۲۳] کا اقتباس دیا ہے جس کی روشنی میں بتایا ہے کہ ایک مخبر گوری شنکر نے

۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک پرچہ انگریزوں کے یہاں بھیجا تھا جس میں اس الزام کا ذکر تھا۔ اس کے بعد غالب کی پریشانی اور بے گناہی وصفائی ثابت کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کا ذکر کیا ہے، کہیں سے یہ پتا چلا کہ یہ سکہ تو ذوق نے ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقع پر لکھا تھا اور اسی زمانہ کے اخباروں میں شائع ہوا تھا، اب انھیں ہفت روزہ دہلی اردو اخبار کی جستجو ہوئی اور اس کے لیے متعدد احباب کو خطوط[29] لکھے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ان سب کے باوجود وہ پنشن اور دربار کے بحال ہو جانے سے مایوس نہیں تھے، دسمبر ۱۸۵۹ء کے اواخر میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے میرٹھ میں دربار کیا، غالب کی یاد دہانی پر بھی ان کو دعوت نامہ نہ ملا[30]، اس پر بھی وہ ہمت نہ ہارے اور گورنر صاحب دربار سے فارغ ہو کر یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دلی پہنچے تو یہ بھی ملاقات کی تمنا میں گئے اور باریاب نہیں کیے گئے[31]۔

اس کے بعد تھک ہار کر غالب نے انگریزی میں درخواست بھیج کر اپنی صفائی اور بے گناہی کے لیے تحقیقات کا مطالبہ کیا مگر یہ بھی مسترد کر دیا گیا[32]۔ مالک رام صاحب سکہ کے الزام کی حقیقت یہ بتاتے ہیں:

قومی دفتر خانہ ہند نئی دہلی میں صادق الاخبار (دہلی) کے شمارہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (جلد ۳ ۱۸) کے صفحہ اول پر یہ عبارت ملتی ہے[33]۔

سکۂ نو طبع زاد جناب حافظ صاحب ویران شاگرد استاد ذوق مرحوم۔

بزر زد سکۂ کشورستانی

سراج الدین بہادر شاہ ثانی

اس کی روشنی میں وہ گوری شنکر کی رپورٹ کو غلط ثابت کر کے لکھتے ہیں:۔

۱۔ یہ سکہ غالب کے بجائے حافظ غلام رسول ویران تلمیذ ذوق نے کہا تھا۔

۲۔ ویران اسے صادق الاخبار کی تاریخ اشاعت ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) سے پہلے ظفر کی خدمت میں پیش کر چکے تھے، ایسی صورت میں غالب کا اس سکے کو ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو ظفر کے حضور پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، لیکن بدقسمتی سے نہ غالب

کو اس کا علم تھا، نہ ان کے کسی دوست کو اور چونکہ وہ مخبر کے اتہام کو غلط نہ ثابت کر سکے اس لیے یہ جرم گویا ثابت ہو گیا، سزا کے طور پر پنشن بھی بند ہو گئی اور دربار و خلعت کا اعزاز بھی چھن گیا، پھر اگر پنشن دوبارہ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوئی اور دربار کا اعزاز ۱۸۶۳ء میں بحال ہوا تو حقیقتہً ان سے رعایت کی گئی تھی، اس میں نواب صاحب رام پور اور دوسرے اصحاب کی مساعی کو دخل تھا، ورنہ حکومت نے انھیں کبھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں انھوں نے جب حکومت سے یہ تین مطالبے کیے[۲۴]

۱۔ مجھے ملکہ معظمہ کا شاعر دربار مقرر کیا جائے۔ ۲۔ دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا ہو۔ ۳۔ میری کتاب دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ اس پر غدر میں ان کے رویہ کی تحقیقات کا حکم ہوا تو یہی رپورٹ سامنے آئی جس میں سکہ کا یہ الزام ان سے منسوب تھا، اس لیے حکومت نے ان کی سب درخواستیں مسترد کر دیں۔

غالب سے ایک دوسرے سکہ کو منشی جیون لال نے منسوب کیا تھا، اس کا ذکر خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے[۲۵]، شعر یہ ہے:

برزرِ آفتاب و نقرۂ ماہ
سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

اس کی تردید کرتے ہوئے مالک رام صاحب دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ منشی جیون لال مانک کایستھ انگریزی حکومت میں کمشنر دہلی کے دفتر میں ملازم تھے، مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہ دلی پر قابض ہو گئی تو یہ بیکار ہو گئے۔ ان ایام میں وہ روزنامچہ لکھنے لگے، اس بنا پر یہ ناممکن ہے کہ وہ ہنگامے کے دنوں میں قلعہ میں بار پا سکے، اگر وہ اس کی کوشش بھی کرتے تو خطرہ سے خالی نہ ہوتی، انھوں نے یہ روزنامچہ انگریزوں ہی کے لیے لکھا تھا جب ہی تو مٹکاف کی خدمت میں اسے پیش کیا تھا، یہ گوری شنکر کی طرح تنخواہ دار ملازم نہ تھے، تاہم انگریزوں کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھنے میں دونوں کی خدمات یکساں تھیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی یہ بات زیادہ صراحت سے لکھی ہے[۲۶]۔ غرض اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ منشی جیون لال نے سن سنا کر یہ سکہ غالب کے نام منسوب کر دیا، یہ

ان کی تحقیق و دریافت کا نتیجہ نہیں ہے۔

۲۔ مرزا غالب خود اس کا انکار کرتے ہیں، وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں[۳۷]:

"میں نے سکہ نہیں کہا، اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔"

مالک رام صاحب اس کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ اصل بیان تو یہی ہے کہ "میں نے سکہ نہیں کہا۔" بعد کی شرط بغرض محال اور بدرجہ مجبوری بیان ہوئی ہے، اس لیے اس سے استدلال کو وہ درست نہیں مانتے اور یہ کہتے ہیں کہ اگر دوسرا سکہ کہا ہوتا تو یہ مطالبہ نہ کرتے[۳۸]:

"باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے، اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہوتا کہ میری بے گناہی ثابت ہو۔"

اس بے باکی اور تحدی سے تحقیقات کا مطالبہ ثابت کرتا ہے کہ پہلے کی طرح دوسرا سکہ بھی انھوں نے نہیں کہا تھا کیوں کہ پہلے کی تحقیق کے دوران میں عین ممکن تھا کہ یہ دوسرا سکہ جیون لال والا برآمد ہو جاتا اور لینے کے دینے پڑ جاتے، غالب کے مخالفین کی کمی نہ تھی، بہادر شاہ کے مقدمے میں لوگوں نے کس کس طرح ان کے خلاف گواہیاں دی تھیں۔

خواجہ احمد فاروقی کے استدلال کا یہ پہلو بھی تھا کہ "شعر کا خوبصورت انداز غالب کے طرز اسلوب سے ہم آہنگ ہے[۳۹]۔" مالک رام نے اس کی تردید میں پہلے تو یہ کہا ہے کہ خواجہ صاحب کا مدعا ہی عنقا ہے، اگر ان کا مقصد سیم وزر کی وہ تشبیہیں ہیں جو سورج اور چاند سے دی گئی ہیں تو اس طرح کی تشبیہیں لکھنے میں غالب یکتا و منفرد نہیں ہیں، سکوں کے لیے ان کا استعمال بہت عام ہے جس کے ثبوت میں متعدد اشعار پیش کیے ہیں[۴۰]، مالک رام کی تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ "منشی جیون لال نے بھی سُنی سُنائی بات پر یقین کر کے یہ سکہ غالب کے نام لکھ دیا، یہ غالب کا کہا ہوا نہیں ورنہ وہ کبھی تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے۔"

مالک رام صاحب نے ایک اور سکے کا ذکر کیا ہے جس کو ان کے بیان کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم نے محض قیاس آرائی سے غالب کی جانب منسوب کر دیا ہے، ملاحظہ ہو۔

سکّہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ
شاہ ہندوستاں بہادر شاہ[۲]

ڈاکٹر خلیق انجم کے خیال میں غالب پر دو سکّوں کا الزام تھا جیساکہ غالب نے خود اپنے ایک خط[۲] بنام عبدالغفور سرور میں لکھا ہے اور وہ اس سے اپنی برات ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ مالک رام صاحب کے نزدیک دو سکّوں[۳] کا ذکر غالب سے پہلی مرتبہ میر احمد حسین نے کیا تھا، اسی بنا پر انھوں نے عبدالغفور سرور کے خط میں دو سکّوں کا ذکر کردیا ہے ورنہ اوّل و آخر کبھی ان پر دو سکّوں کا الزام نہ تھا، اس کے ثبوت میں وہ بتاتے ہیں کہ جب غدر کے بعد وہ دلّی کے کمشنر صاحب سے ملاقات کے لیے گئے تو صاحب بہادر نے صاف کہا تھا کہ آپ پر یہ سکّہ کہنے کا الزام ہے۔[۳]

مالک رام صاحب کی تحقیق میں اساسی طور پر ڈاکٹر خلیق انجم کا دو سکّوں کا نظریہ ہی درست نہیں اس لیے ان کی قیاس آرائیوں کو وہ بے ضرورت اور غلط کہتے ہیں، ان کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ :

"حقیقت یہ ہے کہ دوسرے سکّے کا کبھی کوئی الزام تھا ہی نہیں، نہ اس سے متعلق کوئی شہادت تھی، گوری شنکر نے ایک ہی سکّے کے بارے میں لکھا تھا، اس کے لیے باز پرس ہوئی اور اسی کا الزام آخر تک ان پر قائم رہا۔"

غالبیات میں مالک رام کی تحقیق و تدقیق کی مزید مثالیں ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) شمارہ اگست ۱۹۶۷ء ص ۹۸ (اردو تحقیق نمبر)

۲۔ مالک رام : ذکر غالب ص ۷۶، طبع سوم جنوری ۱۹۵۵ء مکتبہ جامعہ دہلی

۳۔ " " ص ۳۸ بحوالہ زندگانی بے نظیر (پروفیسر عبدالغفور شہباز) ص ۱۹۹

۴ؔ مالک رام: ذکرِ غالب ص ۴۱

۵ؔ " " ص ۴۲

۶ؔ گلِ رعنا (مقدمہ) ص ۳۸ تا ۴۰ مرتبہ جناب مالک رام، علمی مجلس دلّی ۱۹۷۰ء

۷ؔ اس سے دیوان کا وہ قلمی نسخہ مراد ہے جو حافظ محمود خاں شیرانی (متوفی ۱۹۴۶ء) کے پاس تھا، اس میں نسخۂ حمیدیہ کے حواشی کا کلام بھی متن میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اس کی کتابت نسخۂ حمیدیہ کے بعد ہوئی۔ یہ خطی نسخہ خود غالب کا بھی دیکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پورے دیوان میں ان کے ہاتھ کی اصلاحیں ہیں۔ اس نسخہ کا عکسی اڈیشن لاہور سے شائع ہوگیا ہے (۱۹۶۹ء)

۸ؔ گلِ رعنا (مقدمہ ص ۳۵) بحوالۂ آبِ حیات: ۵۱۷

۹ؔ " " ص ۳۶ " " ۴۵۲ و ۴۵۱

۱۰ؔ ذکرِ غالب ص ۱۸۷ بحوالۂ اُردوئے معلّیٰ: ۱۳

۱۱ؔ " "

۱۲ؔ " ص ۱۸۸ " : ۱۳

۱۳ؔ " ص ۱۸۹ " : ۱۰۱

۱۴ؔ مالک رام: ذکرِ غالب ص ۱۸۹ بحوالۂ لطائفِ غیبی: ۳

۱۵ؔ ذکرِ غالب ص ۱۹۰ " : ۳

۱۶ؔ " ص ۲۲۳ و ۲۲۶

۱۷ؔ " ص ۲۴۲ تا ۲۴۹

۱۸ؔ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۱۱۸ طبع اوّل جنوری ۱۹۷۷ء مکتبہ جامعہ نئی دہلی، بحوالہ عقدِ ثریا: ۴۶

۱۹ؔ " " ص ۱۲۱ بحوالہ نقوش لاہور (ادبِ عالیہ نمبر): ۶۹ ۔ ۷۰ (اپریل ۱۹۶۰ء)

۲۰ؔ " " ص ۱۲۲ بحوالہ اُردو: جنوری ۱۹۴۵ء

۲۱ؔ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۱۲۲ بحوالہ دریائے لطافت (اُردو ترجمہ): ۱۵۸

۲۲ؔ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۴۳ بحوالہ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۹۸

۲۳ؔ " " ص ۴۴ بحوالہ خدنگِ غدر: ۴۸ نیز غدر کی صبح شام: ۸۸

۲۴؎ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۸۰ بحوالہ احوال غالب: مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند

۲۵؎ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۴۵ بحوالہ اُردوے معلّٰی: ۳۷ نیز خطوط غالب: ۴۸ بنام تفتہ۔

۲۶؎ مالک رام: فسانۂ غالب ص ۴۱ بحوالہ اُردوے معلّٰی: ۴۱ و نیز خطوط غالب: ۴۵ بنام تفتہ

۲۷؎ " " ص ۱۲ " " ۵۸-۵۹، ۸۴ و " : ۳۴-۳۵، ۳۶

۲۸؎ " " ص ۱۲۸ بحوالہ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد (علی گڑھ ۱۹۴۹ء) بلاک ص ۵

۲۹؎ مالک رام: فسانۂ غالب: ص ۱۲۹، ۱۳۱ بحوالہ اُردوے معلّٰی: ۹۹، ۲۴۹

۳۰؎ " " ص ۱۳۱ " " : ۲۱۱

۳۱؎ " " ص ۱۳۲ " " : ۱۲۳، ۲۱۰، ۲۱۱

۳۲؎ " " ص ۱۳۱ " " : ۲۱۱

۳۳؎ " " ص ۱۳۴ بحوالہ غدر کے اخبارات، صادق الاخبار (ذخیرہ ۴-۶)

۳۴؎ " " ص ۱۳۵ بحوالہ قومی دفتر خانہ ہند فارن، ستمبر ۱۸۶۵ء (۳-۵)

۳۵؎ " " ص ۱۳۶ " معارف (اعظم گڑھ) نومبر ۱۹۵۸ء: ۲۹۲

۳۶؎ " " ص ۱۳۰ " نقش آزاد: ۳۰۴ (حاشیہ) نیز دیکھیے غالب از مہر، ۳۱۴-۳۱۸

۳۷؎ " " ص ۱۳۰ " اُردوے معلّٰی: ۲۴۹، خطوط غالب: ۲۱۸

۳۸؎ " " ص ۱۳۰ " " : ۲۱۱

۳۹؎ " " ص ۱۳۹ " معارف نومبر ۱۹۵۸ء: ۲۹۴

۴۰؎ " " ص ۱۳۰، ۱۳۹

۴۱؎ " " ص ۱۴۳ " غالب اور شاہان تیموریہ، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم: ۹۰

۴۲؎ " " ص ۱۴۰ " ملوو ہند: ۳۰-۳۱

۴۳؎ ان سکوں کا ذکر ذوق کی نسبت سے کیا گیا ہے۔

۴۴؎ فسانۂ غالب ص ۱۴۰ بحوالہ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر): بلاک ص ۵ (مقابل ص ۸۰)

ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کی لائبریری میں محفوظ مشاہیر کے خطوط

غالب سے لے کر ہمارے زمانے تک اُردو ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کے تقریباً ڈیڑھ سو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس زمانے کے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد کے مقابلے میں خطوط کے مجموعوں کی یہ تعداد نہیں کے برابر ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمیں خطوط کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوا۔ مشاہیر کے جو خطوط شایع ہو چکے ہیں، ان کی اصل بھی باقی نہیں رہی۔ اصل کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ مرتب بعض مصلحتوں سے کبھی کبھی عبارتوں میں اضافہ کرتا ہے یا بعض عبارتیں حذف کر دیتا ہے۔ اگر وہ خطوط کسی ادارے میں محفوظ ہیں تو بعد کے مرتب مطبوعہ خطوط کا اصل خطوط سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُردو خطوط جمع کرنے کا خیال اوّل تو بہت بعد میں آیا اور دوسرے بہت سنجیدگی سے ہم اس سلسلے میں کام نہیں کر رہے ہیں۔

یہ بات ہے ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء کی جب میں تحقیق کے سلسلے میں حیدر آباد گیا اور وہاں میں نے "ادارۂ ادبیات اُردو" میں مشاہیر کے خطوط کا بیش بہا ذخیرہ دیکھا۔ یہ کارنامہ پروفیسر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کا تھا۔ انھوں نے ادبیات اُردو کی لائبریری میں ایک گوشہ مشاہیر کے خطوط اور دعوت ناموں کا بھی قائم کیا تھا۔ اس گوشے میں خطوط اور

دعوت نامے خاص تعداد میں ہیں۔ لیکن زور صاحب کی وفات کے بعد اس ذخیرے میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد دو اور اداروں نے اس طرف توجہ دی۔ ایک تو انجمن ترقی اُردو (ہند) اور دوسرا خدا بخش لائبریری (پٹنہ)۔

ان دونوں لائبریریوں میں بڑی تعداد میں مشاہیر کے خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ انجمن کی لائبریری میں خطوط کے علاوہ دعوت نامے اور نادر تحریریں بھی شامل ہیں۔ نادر تحریروں سے یہ مراد ہے کہ مصنفین کے آپس میں جو معرکے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں اخباروں اور رسالوں میں جو مضامین چھپتے ہیں، یا کسی مصنف کے بارے میں کوئی اہم بات شایع ہوتی ہے۔ ان سب تحریروں کی نقلیں جمع کی جاتی ہیں۔

میں نے یہ کام ۱۹۸۰ء میں شروع کیا تھا۔ انجمن کی مالی دشواریوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا کہ قیمت دے کر خطوط خریدے جاتے۔ میں نے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے نام آئے ہوئے خطوط ذاتی طور پر مانگے اور مجھے خوشی ہے کہ بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے میری درخواست قبول کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انجمن کی لائبریری میں ستر، اسی ہزار کے قریب خطوط موجود ہیں اور وہ خطوط الگ ہیں، جو بوریوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ ان خطوط کو ترتیب سے رکھنے کے لیے ایک صاحب کا باقاعدہ تقرر کیا گیا ہے۔ جب ہمیں خطوط موصول ہوتے ہیں تو ہم ان کو صاف کرتے ہیں۔ ان پر ایسے کیمکل لگاتے ہیں، جن سے دیمک یا دوسرے کیڑوں سے محفوظ رہیں۔ ان خطوط کے لیے ہم نے چار پانچ قسم کے پولیتھین کے لفافے بنوائے ہیں تاکہ ان میں پوسٹ کارڈ، ان لینڈ، اور چھوٹے بڑے سائز کے خطوط رکھے جا سکیں۔ خطوط پولیتھین کے لفافوں میں رکھ کر لفافوں کا منہ اس طرح بند کر دیا جاتا ہے کہ لفافہ کھولا نہ جا سکے۔ اور پھر ان لفافوں کو بڑی احتیاط سے فائل میں اس طرح لگا دیا جاتا ہے کہ خطوط کو پڑھنے میں کوئی پریشانی حائل نہیں ہوتی۔ ہر خط کے اوپر کلاسی فکیشن نمبر دیا جاتا ہے۔ یہ نمبر اس طرح ہوتے ہیں '۱ : ۵ : ۲۰' اس کا مطلب ہے کہ الماری نمبر ایک، فائل نمبر ۵، خط نمبر ۲۰۔ لائبریری میں جس طرح ہر کتاب کا کیٹلاگ کارڈ بنایا جاتا ہے، ٹھیک اس طرح ہم ہر خط کے دو کارڈ بناتے ہیں۔

کارڈوں کی عبارتیں اس طرح ہوتی ہیں۔
ایک کارڈ پر سب سے اوپر مکتوب الیہ کا نام ہوتا ہے اور دوسرے کارڈ پر سب سے اوپر مکتوب نگار کا نام ہوتا ہے۔

بہ نام : آزاد، جگن ناتھ
خط : خلیق انجم
تاریخ : ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۶ء
حوالہ نمبر : ۱ : ۲

۲ :
خط : خلیق انجم
بہ نام : آزاد، جگن ناتھ
تاریخ : ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۶ء
حوالہ نمبر : ۱ : ۲

کیٹلاگ کیبنٹ میں کارڈوں کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ پہلے وہ سارے کارڈ ایک جگہ ترتیب دیے گئے ہیں، جن میں ہر کارڈ کے اوپر مکتوب نگار کا نام ہوتا ہے۔ ان کارڈوں کی ترتیب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ چند منٹوں میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نیاز فتح پوری کے کتنے خطوط ہمارے یہاں ہیں اور کس کس کے نام ہیں؟ اور دوسرے کیبنٹ سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ ہماری لائبریری میں نیاز فتح پوری کے نام مختلف ادیبوں اور شاعروں کے کتنے خطوط ہیں؟

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اس "گوشۂ خطوط" سے بڑی تعداد میں اسکالرز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم اسکالرز طلبہ کو مفت خدمات فراہم کرتے ہیں اور اگر انھیں کچھ خطوط کی زیروکس کاپی کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم انھیں یہ کاپیاں مفت فراہم کرتے ہیں۔ لیکن جو اسکالرز پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ نہیں لکھ رہے ہیں ان کے ساتھ ہمارا رویہ مختلف ہوتا ہے ایسے اسکالرز خود محقق اور نقاد ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس ہم عصر ادیبوں کے خطوط خاصی تعداد میں ہوتے ہیں۔ انجمن اِن

اسکالرز بھی ان خطوط سے استفادہ کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن اگر وہ کچھ خطوط کی زیروکس کاپیاں مانگتے ہیں تو انجمن یہ شرط لگاتی ہے کہ وہ جتنے خطوط ہم سے طلب کریں، ان سے دگنی تعداد میں انجمن کی لائبریری میں ادیبوں اور شاعروں کے اپنے نام آئے ہوئے خطوط داخل کریں۔ اس طرح اسکالرز کا کام بھی ہو جاتا ہے اور انجمن کے گوشۂ خطوط میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اگر کوئی ادیب انجمن کو خطوط دیتے ہوئے کچھ شرطیں عائد کرتا ہے تو ہم ہمیشہ ان شرطوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ بعض ادیب ہدایت دیتے ہیں کہ ان کے تمام خطوط یا ان کا کچھ حصہ ان کی وفات تک راز میں رکھے جائیں۔

۲: بعض حضرات شرط لگاتے ہیں کہ اگر کوئی اسکالر ان کے دیے ہوئے خطوط شایع کرنا چاہتا ہے تو ان سے اجازت لینی ضروری ہے۔

۳: تین چار حضرات نے اس شرط پر خطوط دیے ہیں کہ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن نقل فراہم نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ وہ خود یہ خطوط مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان شرطوں کا پورا احترام کرتے ہیں۔ ہمیں خطوط کی طرف سے لاپرواہی نہیں برتنی چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے پاس یہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی امانت ہے۔ میں نے بہت سے ادیبوں سے مودبانہ درخواست کی کہ وہ اپنے نام آئے ہوئے خطوط انجمن کی لائبریری میں داخل کریں۔ مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ ذرا وقت مل جائے تو وہ سارے خطوط نکال کر انجمن کو بھیج دیں گے جب بھی میں نے ان لوگوں سے تقاضا کیا، انھوں نے یہی جواب دیا اور یہاں تک کہ وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ یہ بیش بہا ذخیرہ ضایع ہوگیا۔ ایسے بزرگوں میں سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد، سری نیواس لاہوٹی، مالک رام، اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میں یہاں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں:

سہیل عظیم آبادی صاحب کو مکتوب نگاری کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے بزرگوں، ہم عصروں اور اپنے سے کم عمر کے ادیبوں کو بے شمار خطوط لکھے تھے ظاہر ہے کہ جواب میں انھیں بھی خطوط لکھے گئے۔ ایک دفعہ میں پٹنہ میں سہیل صاحب کے گھر گیا تو ان کے گھر میں خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر ہے

کہ میں نے درخواست کی کہ یہ خطوط انجمن کی لائبریری میں داخل کردیجیے۔ وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ انھوں نے کچھ ایسی بات کہی، جس سے اندازہ ہوا کہ خطوط انجمن کو دینے سے پہلے انھیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی خط ایسا ہو، جس میں کوئی راز کی بات ہو تو اسے روک لیا جائے۔ مصروف زندگی کی وجہ سے یہ نوبت کبھی نہیں آئی کہ وہ خطوط کا مطالعہ کرسکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ میں نے اُن کے صاحب زادے سے درخواست کی کہ وہ سہیل صاحب کے نام آئے ہوئے خطوط انجمن کی لائبریری میں داخل کردیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بہت جلد سہیل عظیم آبادی اکیڈمی بنا رہے ہیں اور یہ خطوط اس اکیڈمی کی لائبریری کو دے دیے جائیں گے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ یہ خطوط آپ ہمیں دے دیجیے، ہم ان کی زیروکس کاپی کراکے آپ کو اصل واپس کردیں گے ___ مگر میری درخواست منظور نہیں کی گئی۔ میں نے کچھ لوگوں کو بھی بیچ میں ڈالا۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ خطوط بوریوں میں بھر کر ایک کمرے میں رکھ دیے گئے تھے۔ برسات میں اس کمرے کی چھت ٹپکی اور تین چار بوریوں کے خطوط کاغذ کی لُگدی بن گئے۔ یہ ذخیرہ وہ تھا، جس میں مولوی عبدالحق اور دوسرے بے شمار مشاہیر کے خطوط شامل تھے۔ اس لیے اُردو ادیبوں سے میری درخواست ہے کہ وہ خطوط کسی بھی ایسی لائبریری میں داخل کردیں، جو خطوط سلیقے سے رکھتی ہو۔ بہتر یہ ہے کہ یہ خطوط دو جگہوں پر محفوظ ہوں۔ تاکہ اگر خدانہ کرے، ایک لائبریری کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو دوسری لائبریری میں خطوط کی نقلیں موجود رہیں۔ کون سے خطوط اہم ہیں اور کون سے غیراہم ___ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے ہمیں کسی ادیب کے جتنے خطوط بھی ملیں، انھیں لائبریری میں داخل کرلینا چاہیے۔ بعض خطوط کو غیراہم سمجھ کر ضایع نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں میں ایک دل چسپ مثال دینا چاہتا ہوں:

شاہد احمد دہلوی مرحوم کے میرے نام کچھ خطوط تھے۔ جنھیں میں نے انجمن کی لائبریری میں داخل کرادیا تھا۔ شاہد صاحب اکثر پوسٹ کارڈ پر خط لکھتے تھے اور ان کا خط بہت مختصر، دو چار سطروں پر مشتمل ہوتا تھا۔

ایک اسکالر شاہد احمد دہلوی پر کام کر رہے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ انجمن میں

خطوط کا ذخیرہ ہے تو وہ میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ شاہد صاحب کے چند ہی خطوط ہماری لائبریری میں ہیں اور وہ بھی بہت غیر اہم ہیں۔ بہرحال اسکالر نے لائبریری میں جاکر ان خطوط کا مطالعہ کیا۔ مطالعہ کرنے کے بعد میرے پاس آئے اور انھوں نے بتایا کہ ایک خط میں شاہد صاحب نے آپ کو (خلیق انجم) کو لکھا ہے کہ :

"میں نے جو کتابیں آپ کو بھیجی ہیں، وہ میرے اُستاد محترم چاند خاں صاحب کو پہنچا دیجیے"

اسکالر نے مجھ سے پوچھا کہ یہ چاند خاں صاحب کون ہیں؟ میں نے بتایا کہ شاہد صاحب کلاسیکی موسیقی کے ماہر تھے۔ انھوں نے یہ فن دہلی کے مشہور موسیقار چاند خاں صاحب سے سیکھا تھا۔ وہ صاحب چاند خاں صاحب کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ چاند صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے خاندان کے افراد نے چاند صاحب کو کچھ ڈائریاں دکھائیں، جو بہت دل چسپ تھیں۔ اور شاہد احمد دہلوی پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے بہت اہم۔ ان ڈائریوں سے پتا چلا کہ شاہد صاحب کب چاند خاں صاحب کے شاگرد ہوئے اور اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے دوران کن کن منازل سے گزرے۔ آل انڈیا ریڈیو پر پہلی بار انھوں نے کب گایا؟ اور ریڈیو سے پچیس روپے کا معاوضہ ملا تو کس طرح انھوں نے اپنے استاد اور پیر بھائیوں کی دعوت کی۔ ان ڈائریوں میں شاہد صاحب کے بارے میں اس طرح کے کئی دل چسپ واقعات بیان کیے گئے تھے۔ یہ معلومات صرف اس فقرے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ جو شاہد صاحب نے چاند خاں صاحب کے بارے میں لکھا تھا۔

آخر میں یہ عرض کردوں کہ انجمن کے گوشۂ خطوط میں تقریباً گیارہ سو چالیس ادیبوں اور شاعروں کے خطوط محفوظ ہیں۔ ان میں چند کے نام ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، آغا حیدر حسن دہلوی، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر نثار احمد فاروقی، احترام الدین شاغل، احتشام حسین، احسان دانش، ہری چند اختر، اختر انصاری، اخلاق احمد، اعجاز صدیقی، اعجاز حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، عبداللطیف اعظمی، افتخار امام، سردار جعفری، منوہر سہائے انور، اکبر حیدری کاشمیری، اسلوب احمد انصاری،

حیات اللہ انصاری، بسمل سعیدی، معین احسن جذبی، غلام ربانی تاباں، جوش ملیح آبادی،
گیان چند جین، حسن نعیم، حمیدہ سلطان، شان الحق حقی، خلیق انجم، ڈاکٹر ذاکر حسین، رام لعل،
رشید حسن خاں، ڈاکٹر عابد حسین، بیگم صالحہ عابد حسین، کالیداس گپتا رضا، سید محی الدین قادری زور،
ساحر ہشیار پوری، ساغر نظامی، سروپ سنگھ، آل احمد سرور، عبدالقادر سروری، سلام مچھلی شہری،
سہیل عظیم آبادی، شاہد احمد دہلوی، مسعود حسین خاں، رشید احمد صدیقی، صباح الدین عبدالرحمن،
ظہیر احمد صدیقی، صغرا مہدی، ظ۔ انصاری، عابد علی خاں، مولوی عبدالحق، خواجہ احمد عباس،
قاضی عبدالودود، عتیق صدیقی، عبدالحمید عدم، امتیاز علی خاں عرشی، شمس الرحمن فاروقی، خواجہ
احمد فاروقی، فراق گورکھ پوری، فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر،
حامد حسین قادری، عبدالرزاق قریشی، قمر رئیس، راج بہادر گوڑ، کنور محمد اشرف، پنڈت برج
موہن دتاتریہ کیفی، آئی۔ کے۔ گجرال، مالک رام، محمد حسن، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، تلوک چند محروم،
مجنوں گورکھ پوری، مجروح سلطان پوری، محمد طفیل، سکندر علی وجد، نجیب اشرف ندوی، میکش
اکبرآبادی، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، یوسف ناظم، انور سعید، جمیل جالبی، معین الرحمن۔

خطوط کی طرح انجمن نے "آواز" کی لائبریری بھی بنائی ہے۔ اس لائبریری میں پچھلے پندرہ سال سے برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے بیشتر معاصر بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں کی آوازیں انجمن کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ انجمن کی لائبریری میں تین گوشے قایم کیے گئے ہیں۔ ایک تو خطوط کا، دوسرے نوادرات کا اور تیسرا آوازوں کا اس میں ایک اور گوشہ کا اضافہ کر لیجیے اور وہ ہے A DIO VISUAL C DS T E کا۔

دہلی میں انجمن واحد ادارہ ہے، جو معاصرین کے خطوط، آوازیں اور نوادرات جمع کر رہا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام کام ایک ادارے کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ دہلی کے چار ادارے انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی، اور دہلی اردو اکیڈمی، ان چاروں گوشوں کو تقسیم کر لے۔ یعنی خطوط کا گوشہ تو انجمن میں قایم ہے، باقی گوشوں میں سے ایک ایک گوشہ یہ تینوں ادارے قایم کریں تاکہ زیادہ بہتر۔

ہو سکے۔ ہمارے زمانے میں ان چیزوں کی شاید کچھ زیادہ اہمیت نہ ہو۔ لیکن آج سے سو سال بعد یہ چیزیں تاریخ ادب اُردو کا بیش بہا خزانہ ہوں گی۔ اگر ہم معمولی سی توجہ کریں تو یہ انمول خزانہ محفوظ ہو سکتا ہے۔

میں نے اس مقالے کے لیے انجمن میں محفوظ خطوط کی ایک فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ ابھی چالیس صفحات پر مشتمل یہ فہرست مرتب ہوئی تھی کہ میں ہمت ہار گیا۔ اور بقیہ فہرست اپنے دفتر کے ساتھی انیس احمد صاحب سے تیار کرائی۔ انجمن کی لائبریری میں تقریباً ستر اسّی ہزار خطوط ہیں، یہ اُن کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہیں۔

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
ابوالکلام آزاد	منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی	۱	جگن ناتھ آزاد	نازش پرتاب گڑھی	۱
" "	غلام رسول مہر	۱	" "	رام لعل	۲
" "	قاضی عبدالغفار	۴	" "	نسیم درانی	۱
" "	یحییٰ اعظمی	۴	" "	محمد حسن	۱
" "	مولانا عبدالماجد دریابادی	۶	" "	اسلم پرویز	۲
جگن ناتھ آزاد	خلیق انجم	۱۶۵	" "	ظفر ادیب	۱۹
" "	مظفر حنفی	۱	" "	وی شنکر	۱
" "	آل احمد سرور	۵	" "	خلیفہ اقبال حسین	۱
" "	حفیظ الدین	۸	" "	پرمانند جی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۱۹	" "	خواجہ احمد عباس	۱
" "	انور کمال حسینی	۱	" "	گیان چند جین	۲۳
" "	شمس الرحمٰن فاروقی	۱	" "	صباح الدین عبدالرحمٰن	۱
" "	صباح الدین عمر	۱	" "	شاہد علی خاں	۱
" "	وزیر آغا	۱	" "	شیر محمد اختر	۱

خط	بہ نام	تعداد
جگن ناتھ آزاد	علی سردار جعفری	۱
" "	کنول ڈبائیوی	۲
" "	عبد المغنی	۲
" "	صالحہ عابد حسین	۱
" "	پنڈت آنند نرائن ملا	۳
" "	شمیم جہاں	۱۴
آزاد گلاٹی	خلیق انجم	۵
" "	ظفر ادیب	۲۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۱۰
" "	پریم پال اشک	۱
محمد اسمٰعیل آزاد	مظفر حنفی	۳
مسرت حسین آزاد	مظفر حنفی	۱
آغا حیدر حسن مرزا	حمیدہ سلطان	۴
شاہ آفاق احمد احمدی	نثار احمد فاروقی	۲
ستیہ پال آنند	ظفر ادیب	۱
ابو محمد شبلی	نثار احمد فاروقی	۱
مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی	نثار احمد فاروقی	۱۰۱
" " "	پریم پال اشک	۷
" " "	ظفر ادیب	۱
" " "	سید مسعود حسن رضوی	۱

خط	بہ نام	تعداد
مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی	رشید حسن خاں	۲
" " "	سلام سندیلوی	۱
اجمل اجملی	خلیق انجم	۱
مرزا عارف اجمل	مظفر حنفی	۱
اجمل نقشبندی	مظفر حنفی	۱
احترام الدین	حمیدہ سلطان	۱
احتشام اختر	مظفر حنفی	۱
احتشام حسین	خلیق انجم	۱۳
" "	ڈی. آر. گوئل	۱
" "	ظفر ادیب	۱۲
" "	نثار احمد فاروقی	۶
" "	عمیق حنفی	۱
" "	حنیف کیفی	۱
" "	آفاق احمد	۲
"	الیس فرید	۱
" "	گیان چند جین	۲۵
" "	آصف شمسی	۱
" "	آفاق حسین صدیقی	۱
" "	عشرت قادری	۱
" "	صالحہ عابد حسین	۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
احتشام حسین	جگن ناتھ آزاد	۱	اختر الایمان	نثار احمد فاروقی	۲
" "	عبد المغنی	۵	" "	عمیق حنفی	۱
" "	سری نیواس لاہوٹی	۴	اختر انصاری	ظفر ادیب	۱
" "	احمد حسین انصاری	۱	اختر انصاری اکبرآبادی	خلیق انجم	۱۱
" "	فکر تونسوی	۱	اختر اورینوی	خلیق انجم	۱
" "	فراق گورکھپوری	۱	جاں نثار اختر	خلیق انجم	۲
" "	شمیم حنفی	۶۵	اختر جبیں	مظفر حنفی	۱
" "	محمد یاسین	۱	اختر رضوی	ظفر ادیب	۱
" "	سلام سندیلوی	۹	سید حسن اختر	مظفر حنفی	۱
احراز نقوی	پریم پال اشک	۱	اختر عازم مرادآبادی	ظفر ادیب	۱
احسان دانش	ظفر ادیب	۸۶	اختر کاظمی	مظفر حنفی	۳
" "	نانک چند	۱	اختر نظمی	مظفر حنفی	۳
" "	دھرم پال گپتا وفا	۱	ہری چند اختر	ساحر ہوشیارپوری	۷
احسن نشاط	خلیق انجم	۱	اخلاق اثر	خلیق انجم	۵
احمد جمال پاشا	نثار احمد فاروقی	۲	" "	کنول ڈبائیوی	۱
احمد سجاد	مظفر حنفی	۳	" "	جگن ناتھ آزاد	۴
سید احمد شمیم	مظفر حنفی	۱	سید ارشاد حیدر	مظفر حنفی	۱
احمد ہمیش	عمیق حنفی	۴	اعجاز علی ارشد	مظفر حنفی	۱
احمق پھپھوندوی	من موہن تلخ	۱۲	" "	خلیق انجم	۵
اختر آصف	مظفر حنفی	۱	ارشد عبدالحمید	مظفر حنفی	۱
اختر الایمان	خلیق انجم	۱	اُدے سرن ارمان	نثار احمد فاروقی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
اسد رضوی	مظفر حنفی	١	اعجاز صدیقی	عبدالمغنی	١
اسلم بدر	مظفر حنفی	۴	" "	جگن ناتھ آزاد	١
اسلم پرویز	خلیق انجم	١	" "	صالحہ عابد حسین	٣
اسلم ملک	مظفر حنفی	١	اشفاق احمد اعظمی	خلیق انجم	٢
اشفاق ہاشمی	مظفر حنفی	١	" "	ظفر ادیب	١
بمل کرشن اشک	ظفر ادیب	١	خلیل الرحمٰن اعظمی	خلیق انجم	١
پروین کمار اشک	مظفر حنفی	٣	" "	نثار احمد فاروقی	٨
پریم پال اشک	ظفر ادیب	١		مظفر حنفی	١
اصغر تاج	ظفر ادیب	١	" "	ظفر ادیب	٣
محمد اجمل اصلاحی	نثار احمد فاروقی	٢	" "	فکر تونسوی	١
اطہر عزیز	مظفر حنفی	٢	" "	عمیق حنفی	١١
اظہر راہی	مظفر حنفی	١	ابن فرید	خلیق انجم	١
عبدالسلام اظہر	مظفر حنفی	١	" "	ظفر ادیب	١٣
اظہر عنایتی	مظفر حنفی	٣	" "	نثار احمد فاروقی	١
اعجاز حسین	رشید حسن خاں	١	" "	گیان چند جین	۴
" "	گیان چند جین	٦	عبداللطیف اعظمی	خلیق انجم	٢۵
" "	سری نیواس لاہوٹی	١			
" "	ظفر ادیب	١	" "	گیان چند جین	۵
اعجاز صدیقی	خلیق انجم	٣	" "	نثار احمد فاروقی	١
" "	آنند نرائن ملا	١			
" "	ظفر ادیب	۵	" "	جگن ناتھ آزاد	١
" "	عمیق حنفی	٧	" "	ظفر ادیب	٢
" "	مظفر حنفی	١			
" "	گیان چند جین	١	" "	ابوسلمان شاہجہاں پوری	١

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تع
افتخار امام	خلیق انجم	۸	امداد صابری	نثار احمد فاروقی	۱
" "	مظفر حنفی	۹	امداد طارق	خلیق انجم	
" "	گیان چند جین	۲	گوپی ناتھ امن لکھنوی	احسان دانش	
" "	کنول ڈبائیوی	۱	" "	خلیق انجم	
" "	جگن ناتھ آزاد	۱	امیر عارفی	ظفر ادیب	
افتخار عارف	خلیق انجم	۷	انجم جمال	ظفر ادیب	
" "	نثار احمد فاروقی	۳	اندر جیت لال	مظفر حنفی	
افسر حمزہ پوری	مظفر حنفی	۲	اسلوب احمد انصاری	خلیق انجم	
اقبال متین	مظفر حنفی	۲	حیات اللہ انصاری	خلیق انجم	
اقبال مسعود	مظفر حنفی	۱	" "	ظفر ادیب	
اکبر الدین صدیقی	نثار احمد فاروقی	۱	" "	جگن ناتھ آزاد	
اکبر حیدری کاشمیری	خلیق انجم	۱۴	" "	گیان چند جین	
مرزا اکبر علی بیگ	نثار احمد فاروقی	۱	مصباح الحسن قیصر	مظفر حنفی	
" "	مظفر حنفی	۱	انور سجاد	خلیق انجم	۱
اکبر علی خاں	خلیق انجم	۲۲	انور سدید	خلیق انجم	-
" "	ظفر ادیب	۱	منوہر سہائے انور	ظفر ادیب	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۲۸	" "	دیوان تصور	
اکرام احمد	خلیق انجم	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۱
اکرم فاروقی	نثار احمد فاروقی	۱	انیس انور	مظفر حنفی	
الفت امین آبادی	ظفر ادیب	۱	انیس جامی	خلیق انجم	
الیاس محمود	مظفر حنفی	۱	انیس صدیقی	نثار احمد فاروقی	

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
اوصاف علی	نثار احمد فاروقی	۱	بزم انصاری	نثار احمد فاروقی	۱
اے۔ ایم۔ ناصرہ	مظفر حنفی	۱	بزمی انصاری	نثار احمد فاروقی	۳
غلام حسین ایاز	مظفر حنفی	۲	بسمل سعیدی	ظفر ادیب	۱
ایس۔ ایم۔ حیات	مظفر حنفی	۱	〃 〃	یونس	۱
ایس۔ کوثر عالم	مظفر حنفی	۱	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱
ایل۔ بی۔ رندھیر	مظفر حنفی	۱	〃 〃	صابر دت	۱
ایم۔ حبیب خاں	نثار احمد فاروقی	۱	بشیر موجد	ظفر ادیب	۲
〃 〃	مظفر حنفی	۱	بشیشور پرشاد منور	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
بادل	پریم پال اشک	۱		ساحر ہوشیارپوری	۱
بادل عباسی	مظفر حنفی	۱		ظفر ادیب	۱
مظفر حسین ہاشمی	مظفر حنفی	۱		گیان چند جین	۱
باقر مہدی	عمیق حنفی	۴	بلبیر راٹھی	ظفر ادیب	۱
باقر نقوی	خلیق انجم	۱	بلدیو شانت	ظفر ادیب	۳
باقی صدیقی	ظفر ادیب	۱	بلراج حیرت	مظفر حنفی	۱
بانی	خلیق انجم	۱	بلراج کومل	عمیق حنفی	۲۰
محمد اسحاق بھٹی	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃	زبیر رضوی	۱
بدر جہاں	مظفر حنفی	۱	〃 〃	خلیق انجم	۱
بدیع الزماں خاور	خلیق انجم	۱	بمل جین	مظفر حنفی	۲
برج ناتھ نیتر	ساحر ہوشیارپوری	۱	امیر چند بہار	خلیق انجم	۱
منظور الحسن برکاتی	نثار احمد فاروقی	۱۰		ظفر ادیب	۳
برکت علی	مظفر حنفی	۲		گوپی چند نارنگ	۲

خط	بہ نام	تعداد
ودیا شنکر بھارگو	پریم پال اشک	۳
بیتاب علی پوری	خلیق انجم	۱
وسیم احمد بیتاب	مظفر حنفی	۱
عابد رضا بیدار	خلیق انجم	۵
	ظفر ادیب	۴
	مظفر حنفی	۲
	نثار احمد فاروقی	۱۰
	گیان چند جین	۲
راجندر سنگھ بیدی	گوپی چند نارنگ	۲
	راج بہادر گوڑ	۲
	سید شہاب الدین دسنوی	۱
مرزا اکبر علی بیگ	مظفر حنفی	۱
بیگم شاہد احمد دہلوی	خلیق انجم	۱
پرتاپ سنگھ کیتل	ظفر ادیب	۱
شہریار پرواز	ظفر ادیب	۱
نندلال پروانہ	ظفر ادیب	۲
غلام ربانی تاباں	خلیق انجم	۲
″ ″ ″	نثار احمد فاروقی	۱
″ ″ ″	جگن ناتھ آزاد	۱۲
″ ″ ″	راج نرائن راز	۱
ذوالفقار احمد تابش	مظفر حنفی	۱
ریاست علی تاج	مظفر حنفی	۱

خط	بہ نام	تعداد
محمد ریاست علی صدیقی تاج	مظفر حنفی	۱
تبسم کاشمیری	پریم پال اشک	۲
تخلص بھوپالی	وجاہت علی سندیلوی	۳
تسکین زیدی	مظفر حنفی	۴
عبدالوہاب تسنیم	خلیق انجم	۱
مسعود بیگ تشنہ	مظفر حنفی	۲
من موہن تلخ	ظفر ادیب	۲
تمکین کاظمی	خلیق انجم	۲
″ ″	نثار احمد فاروقی	۲۰
″ ″	گیان چند جین	۵
توفیق احمد قادری	نثار احمد فاروقی	۳
شہاب الدین ثاقب	خلیق انجم	۱
مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی	منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی	۱
ثمر مانجوی	مظفر حنفی	۱
ثمر نظامی	نثار احمد فاروقی	۱
ثمینہ شوکت	خلیق انجم	۱
جاوید وششٹ	خلیق انجم	۶
″ ″	نثار احمد فاروقی	۱
″ ″	جگن ناتھ آزاد	۱
معین احسن جذبی	خلیق انجم	۲
″ ″ ″	ظفر ادیب	-

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
معین احسن جذبی	فکر تونسوی	۱	جنید شرفی	ظفر ادیب	۱
جعفر حسین	رشید حسن خاں	۱	جوش ادیب	ظفر ادیب	۱
علی سردار جعفری	خلیق انجم	۱۲	جوش ملسیانی	من موہن تلخ	۲
〃 〃	راج نرائن راز	۱	جوش ملیح آبادی	ظفر ادیب	۱
〃 〃	عمیق حنفی	۱	〃 〃	وجاہت علی سندیلوی	۲
〃 〃	گیان چند جین	۱۵	〃 〃	کرنل بشیر حسین زیدی	۱
〃 〃	رام لعل	۱	جوش ملیح آبادی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۹
〃 〃	سرور تونسوی	۱	〃 〃	ساحر ہوشیارپوری	۸
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۳	〃 〃	شنکر پرشاد	۲۵
〃 〃	صالحہ عابد حسین	۲	جوگندر پال	ظفر ادیب	۲
جگر مرادآبادی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۳	〃 〃	خلیق انجم	۳
〃 〃	ساحر ہوشیارپوری	۲	جہاں آرا	مظفر حنفی	۱
〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	۱	رافعہ عتیق جیلانی	مظفر حنفی	۳
جمنا داس اختر	خلیق انجم	۱	سید انیس شاہ جیلانی	نثار احمد فاروقی	۱
جمیل احمد	مظفر حنفی	۱	سید حامد حسین جیلانی	محمد حفیظ الدین	۱
جمیل جالبی	خلیق انجم	۵	گیان چند جین	خلیق انجم	۴۸
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃	ظفر ادیب	۳
〃 〃	کنول ڈبائیوی	۲	〃 〃	مظفر حنفی	۲
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۲۹
〃 〃	گیان چند جین	۵	〃 〃	پریم پال اشک	۱
جمیل مدنی	شیخ عبدالعصیر عاصی نالقی	۱	〃 〃	حمیدہ سلطان	۱
جمیل مظہر	مظفر حنفی	۵	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۹

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
〃 〃	کنول ڈبائیوی	۹	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۲
〃 〃	سرور تونسوی	۱	علی عباس حسینی	نثار احمد فاروقی	۴
〃 〃	رشید حسن خاں	۴	〃 〃	صالحہ عابد حسین	۹
〃 〃	عبدالمغنی	۱	〃 〃	عابد حسین	۲
مہابیر پرشاد جین	خلیق انجم	۱	علی عباس حسینی	گیان چند جین	۱
سید حامد حسین	مظفر حنفی	۲	〃 〃	سلام سندیلوی	۳
حامدی کاشمیری	مظفر حنفی	۲	حفیظ الدین	ظفر ادیب	۲
حباب ہاشمی	مظفر حنفی	۱	حفیظ اللہ خاں	مظفر حنفی	
حرمت الاکرام	شانتی رنجن بھٹہ چاریہ	۱۸	حفیظ جالندھری	ظفر ادیب	۱
حسرت کاس گنجوی	خلیق انجم	۸	حفیظ ہوشیارپوری	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
حسین الحق	مظفر حنفی	۱	〃 〃	ساحر ہوشیارپوری	۳
حسن ثانی نظامی	نثار احمد فاروقی	۱	برہمانند شرما حقیر	ظفر ادیب	۱
حسن جعفری	ظفر ادیب	۱	شان الحق حقی	خلیق انجم	۱۲
قاضی حسن رضا	مظفر حنفی	۳۰	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۲
حسن نظامی	گلزار زتشی دہلوی	۲	〃 〃	گیان چند جین	۴
حسن نعیم	خلیق انجم	۷	〃 〃	ذہین نقوی	۱
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱	حماد ابوالاثر	مظفر حنفی	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۱	حماد احمد	خلیق انجم	۱
حسیب سوز	مظفر حنفی	۳	حمیدہ سلطان	خلیق انجم	۱
حسینی شاہد	خلیق انجم	۲۰	〃 〃	ظفر ادیب	۲۲
〃 〃	گیان چند جین	۱	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۸
〃 〃	مالک رام	۳	〃 〃	سلامی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
حمیدہ سلطان	یوسف حسین خاں	۱	خلیق انجم	مختار الدین احمد	۴
〃 〃	شاہد ماہلی	۱	〃 〃	رام لعل نابھوی	۱۰
〃 〃	خلیق انجم	۱	〃 〃	قاضی عدیل عباسی	۱
حمیرا خاتون	خلیق انجم	۲	〃 〃	سری نیواس لاہوٹی	۱۱
حنیف کیفی	مظفر حنفی	۱	〃 〃	تارا چرن رستوگی	۲
عبدالمجید حیرت	نثار احمد فاروقی	۱۱	〃 〃	مشفق خواجہ	۱
خالد حسین خاں	خلیق انجم	۱	〃 〃	گلزار دہلوی	۱
خالد کفایت	خلیق انجم	۱	〃 〃	شریف الحسن نقوی	۱
خالد محمود	مظفر حنفی	۱	〃 〃	سورج تنویر	۱
سردار گربچن سنگھ خالصہ	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃	اخلاق اثر	۱
گوربخش سنگھ خالصہ	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃	افتخار عارف	۱
خلیق انجم	جگن ناتھ آزاد	۳۵	〃 〃	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱
〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	۲	〃 〃	وجاہت علی سندیلوی	۱
〃 〃	اکبر حیدری کاشمیری	۱	〃 〃	گیان چند جین	۱۲
〃 〃	سلطانہ حیات	۱	〃 〃	رام لعل	۱
〃 〃	سید مظفر حسین برنی	۱	〃 〃	آل احمد سرور	۶
〃 〃	مقیم الدین فاروقی	۱	〃 〃	مرغوب حیدر عابدی	۱
〃 〃	شاہد ماہلی	۱	〃 〃	راج بہادر گوڑ	۴
〃 〃	ظفر ادیب	۱	〃 〃	فکر تونسوی	۱
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱۱	〃 〃	وشوا ناتھ طاؤس	۱
〃 〃	صباح الدین عبدالرحمٰن	۱	〃 〃	کاظم علی خاں	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
خلیق انجم	رشید احمد صدیقی	۱	غلام نبی خیال	خلیق انجم	۱
〃 〃	اکبر حیدری	۱	خیر بہوروی	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۹
〃 〃	خواجہ احمد فاروقی	۱	داغ دہلوی	مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی	۱
〃 〃	عبد القوی دسنوی	۵	جگدیش مہتہ درد	ظفر ادیب	۳
〃 〃	امتیاز علی عرشی	۱	سید شہاب الدین دسنوی	خلیق انجم	۴۷
〃 〃	مظفر حنفی	۳	〃 〃 〃	مالک رام	۱
〃 〃	شمس الرحمن فاروقی	۱	〃 〃 〃	آل احمد سرور	۳
〃 〃	اکبر علی خاں	۱	〃 〃 〃	قاضی عبد الغفار	۱
〃 〃	آزاد گلاٹی	۱	عبد القوی دسنوی	خلیق انجم	۲۵
〃 〃	عابد علی خاں	۱	〃 〃 〃	مظفر حنفی	۳۲
〃 〃	قرۃ العین حیدر	۱	〃 〃 〃	خالد محمود	۱
〃 〃	رفعت سروش	۱	〃 〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱۱
〃 〃	عبد المغنی	۲	〃 〃 〃	راج نرائن راز	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۱	〃 〃 〃	گیان چند جین	۱۱
خواجہ حسن نظامی	محمود احمد عباسی	۵	〃 〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
〃 〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃 〃	صالحہ عابد حسین	۱
خورشید الاسلام	خلیق انجم	۷	دلشاد عالم لاری	مظفر حنفی	۲
〃 〃	ظفر ادیب	۱	ضمیر حسن خاں دلّی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۲
〃 〃	سید مسعود حسن رضوی	۱	عبد الستار دلوی	خلیق انجم	۴
خوشحال زیدی	مظفر حنفی	۱	فقیر چند دیوانہ	ظفر ادیب	۱
خوشونت سنگھ	پنڈت آنند نرائن ملا	۲	دیویندر اسّر	ظفر ادیب	۲۵

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
دیویندر اسّر	مظفر حنفی	۱	راحت علی خاں	خلیق انجم	۱
〃 〃	خلیق انجم	۱	راج نرائن راز	عمیق حنفی	۱۷
ضیاء الدین ڈیسائی	خلیق انجم	۱	〃 〃	گیان چند جین	۵
ڈی. کے. گپتا	خلیق انجم	۱	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
ڈاکٹر ذاکر حسین	گلزار زتشی دہلوی	۱	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱
〃 〃	خلیق انجم	۲	شفیع اللہ خاں راز	مظفر حنفی	۱۱
〃 〃	ساغر نظامی	۲	راز یزدانی	خلیق انجم	۲
〃 〃	قاضی عبدالغفار	۲	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۴
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۵	راشد	مظفر حنفی	۱
〃 〃	پی. ایس. ساہنی	۱	راغب شکیب	مظفر حنفی	۶
〃 〃	گیان چند جین	۱	راقم صدیقی	ظفر ادیب	۱
〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	۸	رام لعل	خلیق انجم	۲۲
〃 〃	اشفاق محمد خاں	۵	〃 〃	مظفر حنفی	۱
〃 〃	شفیق محمد خاں	۱	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱۲
〃 〃	سعادت علی صدیقی	۱	〃 〃	عمیق حنفی	۱
ذکیہ احسان	خلیق انجم	۱	〃 〃	گیان چند جین	۲۰
ذکیہ انجم	خلیق انجم	۵	〃 〃	ظفر ادیب	۱
ذہین نقوی	خلیق انجم	۷	〃 〃	مالک رام	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۱	〃 〃	سعادت علی صدیقی	۱
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۳	رامیشور ٹھاکر	خلیق انجم	۱
راجندر سنگھ ورما	مظفر حنفی	۱	رانا گنوری	پریم پال اشک	۱

خط	بہ نام	تعداد
رشمی امانت راہی	مظفر حنفی	۱
شیخ رحمان اکولوی	مظفر حنفی	۵
رحمٰن نیّر	مظفر حنفی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۱
رحمت امروہوی	ظفر ادیب	۱
رحم علی الہاشمی	خلیق انجم	۱
تاراچرن رستوگی	خلیق انجم	۲۲
" " "	گیان چند جین	۵۲
" " "	جگن ناتھ آزاد	۲۳
" " "	نثار احمد فاروقی	۳
رشید افروز	مظفر حنفی	۱
رشید جہاں	وجاہت علی سندیلوی	۲
رشید حسن خاں	خلیق انجم	۳۴
" " "	محمود سعیدی	۱
" " "	نثار احمد فاروقی	۱
" " "	گیان چند جین	۱۵
" " "	ظفر ادیب	۱
" " "	شاہد ماہلی	۲
" " "	اطہر فاروقی	۲
" " "	جگن ناتھ آزاد	۲
" " "	سید فریدالدین شاہ مسکینی	۱
رشید موسوی	خلیق انجم	۱۱
کالی داس گپتا رضا	خلیق انجم	۵
" " "	ظفر ادیب	۳۰
" " "	گیان چند جین	۵۰
رضاء الجبار	نثار احمد فاروقی	۱
رضوان احمد	خلیق انجم	۱۹
" "	گیان چند جین	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۱
سید محمد جعفر رضوی	مظفر حنفی	۱
سید مسعود حسن رضوی	نثار احمد فاروقی	۴
" " "	صدر آہ	۲۷
" " "	سید شہاب الدین دسنوی	۹
" " "	سلام سندیلوی	۱۰
ظہیر عباس رضوی	نثار احمد فاروقی	۱
رضیہ حامد	مظفر حنفی	۱
رفعت زہرہ	حمیدہ سلطان	۱
رفعت سروش	مظفر حنفی	۱
" "	خلیق انجم	۲
" "	نثار احمد فاروقی	۱
مبارز الدین رفعت	نثار احمد فاروقی	۵۵
رفیق خاور	ظفر ادیب	۱

خط	بہ نام	تعداد
رفیق شاکر	مظفر حنفی	۱
روشن صدیقی	نثار احمد فاروقی	۱۷
〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	۸
روشن بیشالوی	ظفر ادیب	۲
دولت نعیم	مظفر حنفی	۲
چودھری ریاض الدین	مظفر حنفی	۱
رئیس امروہوی	خلیق انجم	۳
رئیس انور رحمٰن	مظفر حنفی	۱
صابر حسین رئیس	مظفر حنفی	۱
نثار احمد زار	مظفر حنفی	۱
زاہدہ ابوالحسن	ظفر ادیب	۱
بھاگیرتھ لال زخمی حصاری	ظفر ادیب	۱
دکی تال گکانوی	خلیق انجم	۱
سید محی الدین قادری زور	خلیق انجم	۷
〃 〃 〃	ظفر ادیب	۱
〃 〃 〃	ملک محمد علی خاں	۱
〃 〃 〃	گیان چند جین	۲
〃 〃 〃	نثار احمد فاروقی	۴
〃 〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱
〃 〃 〃	سری نیواس لاہوٹی	۱
〃 〃 〃	سلام سندیلوی	۱۰

خط	بہ نام	تعداد
زہرہ	سید حامد حسین جیلانی	۱
کرنل بشیر حسین زیدی	خلیق انجم	۲
〃 〃 〃	جوش ملیح آبادی	۱
〃 〃 〃	صالحہ عابد حسین	۲
〃 〃 〃	اشفاق محمد خاں	۱
شمع افروز زیدی	مظفر حنفی	۴
علی جواد زیدی	خلیق انجم	۳۶
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
〃 〃	گیان چند جین	۴
〃 〃	ظفر ادیب	۲
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱
〃 〃	صالحہ عابد حسین	۲
زین العابدین	ظفر ادیب	۱
عبدالصمد خاں ساحل عارفی	مظفر حنفی	۲
ساجن پردیسی	مظفر حنفی	۱
ساحر ہوشیارپوری	ظفر ادیب	۱۲
〃 〃 〃	مظفر حنفی	۱
〃 〃 〃	خلیق انجم	۷
〃 〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱۰
〃 〃 〃	محمود سعیدی	۱
〃 〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
〃 〃 〃	گیان چند جین	۵
ساحل احمد	خلیق انجم	۱

خط	بنام	تعداد	خط	بنام	نق
محمد شرف الدین ساحل	مظفر حنفی	۱	سحر عشق آبادی	رشید حسن خاں	
ساغر برنی	مظفر حنفی	۱	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	ظفر ادیب	
ساغر نظامی	خلیق انجم	۵	" " "	خلیق انجم	
" "	نثار احمد فاروقی	۱۴	" " "	جگن ناتھ آزاد	
" "	جگن ناتھ آزاد	۱	سراج الدین	ظفر ادیب	
" "	گیان چند جین	۲	سراج انور	خلیق انجم	
" "	بیگم جگن ناتھ آزاد	۱	" "	مظفر حنفی	
" "	ظفر ادیب	۲	سراج درپن	ظفر ادیب	
" "	ساحر ہوشیار پوری	۳	سراج زیبائی	مظفر حنفی	
عبدالمجید سالک	ساحر ہوشیار پوری	۲	عبدالقادر سروری	گیان چند جین	
سالک لکھنوی	خلیق انجم	۶	" "	سلام سندیلوی	
" "	مظفر حنفی	۴	سعید احمد	مظفر حنفی	
رام لعل سائل	ظفر ادیب	۲۹	سعید احمد اکبر آبادی	نثار احمد فاروقی	
سبط حسن	راج بہادر گوڑ	۱۲	" " "	خلیق انجم	
ستیہ پال آنند	ظفر ادیب	۱	" " "	ظفر ادیب	
سجاد ظہیر	خلیق انجم	۱	سعید ہاشمی	خلیق انجم	
" "	ظفر ادیب	۱	سکندر حمید عرفان	مظفر حنفی	
ابوالفیض سحر	خلیق انجم	۱	سگار لکھنوی	مظفر حنفی	
ابو محمد سحر	خلیق انجم مظفر حنفی	۱ ۲	سلام سندیلوی	مظفر حنفی	
" "	نثار احمد فاروقی	۱۵	" "	خلیق انجم	
		۱	سلام صدیقی میرٹھی	ظفر ادیب	

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
سلام مچھلی شہری	خلیق انجم	۲	سرشار سیلانی	ظفر ادیب	۲
" "	وجاہت علی سندیلوی	۱	سروپ سنگھ	خلیق انجم	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۲	آل احمد سرور	خلیق انجم	۶۵
سلطان اختر	مظفر حنفی	۱	" "	پنڈت آنند نرائن ملا	۵
سلطان اشرف	ظفر ادیب	۲	" "	ظفر ادیب	۳۰
سلطان رشک	مظفر حنفی	۳	" "	امتیاز علی عرشی	۳
سلطانہ حیات	خلیق انجم	۲	" "	قاضی محمد عدیل عباسی	۱
سلمان الاپسند	مظفر حنفی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۲۷
سلمان عباسی	مظفر حنفی	۱	" "	ماہر	۱
سلیم احمد	خلیق انجم	۱	" "	حمین حسنی	۷
سلیمان اریب	خلیق انجم	۱	" "	جگن ناتھ آزاد	۲۰
سلیمان خمار	مظفر حنفی	۲	" "	خواجہ فاروقی	۱
سمیع اللہ عثمانی	مظفر حنفی	۱	" "	گیان چند جین	۶۰
سورج سنویر	ظفر ادیب	۶۷	" "	حنیف نقوی	۱
" "	خلیق انجم	۲	" "	حمیدہ سلطان	۵
سید ملیحی	مظفر حنفی	۱	" "	سید مسعود حسن رضوی	۵
سراج الحسن سراج لکھنوی	جگن ناتھ آزاد	۲	" "	عبدالمغنی	۱
" "	ظفر ادیب	۳	" "	صالحہ عابد حسین	۲
سراج نقوی	خلیق انجم	۱	سرور تونسوی	ظفر ادیب	۱۷
سردار احمد	مظفر حنفی	۲	" "	مظفر حنفی	۱
	ڈولی منڈاۓ	۱		کنول ڈبائیوی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
سرور تونسوی	جگن ناتھ آزاد	۳	سید عابد علی عابد	خلیق انجم	۲
سرور عثمانی	مظفر حنفی	۲	سید عبد المنان	خلیق انجم	۱
عبد القادر سروری	خلیق انجم	۶	سید عبد اللہ	ظفر ادیب	۴
" "	خواجہ احمد فاروقی	۱	" "	سید مسعود حسن رضوی	۱
سہیل عظیم آبادی	خلیق انجم	۴۷	سید علی	ظفر ادیب	۳
" "	ظفر ادیب	۶	سید محمد جعفری	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
" "	آل احمد سرور	۴	" "	ساحر ہوشیارپوری	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۲۹	سید محمود	ظفر ادیب	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۱	سیدہ اختر	پرکاش چندر	۱
" "	گیان چند جین	۵	" "	ساحر ہوشیارپوری	۳
" "	سید شہاب الدین دسنوی	۵۱	سیدہ جعفر	خلیق انجم	۴
" "	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۷۰	سیدہ شان معراج	مظفر حنفی	۵
سید جعفر عباس	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱	" "	خلیق انجم	۴
سید حامد	خلیق انجم	۶	خلیل الرحمن شاد	مظفر حنفی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۲	نریش کمار شاد	ظفر ادیب	۳
سید حامد حسین	مظفر حنفی	۲	شاذ تمکنت	خلیق انجم	۱
سید حسن	خلیق انجم	۲۲	" "	قمر رئیس	۱
سید حسن عباس	مظفر حنفی	۱	عبد السلام شارق	مظفر حنفی	۱
سید ولی الدین	نثار احمد فاروقی	۱	شاذ صدیقی	ظفر ادیب	۱
سید شمشاد احمد	نثار احمد فاروقی	۲	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جگن ناتھ آزاد	۱
سید صفدر	مظفر حنفی	۲	" "	خلیق انجم	۲۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
شاہی رنجن بھٹہ چاریہ	گیان چند جین	۹	شاہین بدر	مظفر حنفی	۷
" "	ظفر ادیب	۱	شباب	پریم پال اشک	۱
" " "	عبدالمغنی	۱	عاصم شہنواز شبلی	مظفر حنفی	۳
شاہد احمد دہلوی	خلیق انجم	۱۵	غلام کبریا خاں شبلی	مظفر حنفی	۱
" "	وجاہت علی سندیلوی	۳	شجاع خاور	خلیق انجم	۴
" "	چاند خاں	۴	" "	ظفر ادیب	۹
" "	من موہن تلخ	۳	جانکی پرشاد شرما	مظفر حنفی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۳	دلیپ راج شرما	ظفر ادیب	۱
" "	مخمور سعیدی	۱	ہمت رائے شرما	خلیق انجم	۹
" "	صالحہ عابد حسین	۱	" "	مخمور سعیدی	۱
" "	رشید حسن خاں	۲	شعائر اللہ خاں	نثار احمد فاروقی	۲
خواجہ حمید الدین شاہد	خلیق انجم	۲	شفیق کوٹی	ظفر ادیب	۱
" " "	جگن ناتھ آزاد	۱۳	شفیقہ فرحت	مظفر حنفی	۱
" " "	ظفر ادیب	۱	ضیاء الدین شکیب	خلیق انجم	۴
" " "	سری نیواس لاہوٹی	۱	" " "	نثار احمد فاروقی	۴
شاہد ساگری	مظفر حنفی	۳	شکیل اعجاز	مظفر حنفی	۲۱
شاہد میر	مظفر حنفی	۲	" "	گوپی چند نارنگ	۱
شاہد ندیم	مظفر حنفی	۷	شکیل الرحمٰن	خلیق انجم	۱۸
شاہ محمد حسین	نثار احمد فاروقی	۲	" "	گیان چند جین	۳
محمد علی شاہ	مظفر حنفی	۱	شکیل بدایونی	جگن ناتھ آزاد	۱
شاہجہاں بیگم	مظفر حنفی	۱	گلزار احمد شمسی	مظفر حنفی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
شمیم احمد	مظفر حنفی	۱	شہریار	نثار احمد فاروقی	۱
شمیم حنفی	خلیق انجم	۲	" "	عمیق حنفی	۳۱
" "	عمیق حنفی	۱۰	شہنشاہ حسین رضوی	مہیش پرشاد	۱
" "	مظفر حنفی	۱	صابر دت	ظفر ادیب	۱
" "	گیان چند جین	۴	صابر ناہد	مظفر حنفی	۱
شمیم عثمانی	نثار احمد فاروقی	۲	صابر سنبھلی	خلیق انجم	۱
شمیم کرہانی	جگن ناتھ آزاد	۳	محمد قمر الدین صابری	نثار احمد فاروقی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۱	یوگیندر پال صابر	مظفر حنفی	۲
شورش اسحاقی	ظفر ادیب	۱	صادق گیاوی	مظفر حنفی	۱
شوق بہرائچی	ظفر ادیب	۱	صالحہ عابد حسین	خلیق انجم	۱۰
شوق ماہری	مظفر حنفی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۵
شوکت تھانوی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱	" "	بیگم نثار احمد فاروقی	۱
" "	ساحر ہوشیار پوری	۴	" "	گیان چند جین	۲
شوکت حیات	مظفر حنفی	۱	" "	عزیز سیدین	۱
شوکت سبزواری	ظفر ادیب	۱	" "	ظفر ادیب	۴
شہاب جعفری	عمیق حنفی	۵	صبا اکرام	مظفر حنفی	۱
شہباز حسین	نثار احمد فاروقی	۲	صبا بلگرامی	مظفر حنفی	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۲	خالد رشید صبا	خلیق انجم	۱
شہپر رسول	مظفر حنفی	۴	صباح الدین عبدالرحمٰن	خلیق انجم	۳۰
شہریار	خلیق انجم	۱	" "	جگن ناتھ آزاد	۷
" "	مظفر حنفی	۲	" "	گیان چند جین	۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
صباح الدین عبدالرحمٰن	شاہد ماہلی	۲	رشید احمد صدیقی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۴
" " "	وقار الحسن صدیقی	۱	" "	صالحہ عابد حسین	۳
" " "	مسعود حسن	۱	زکی طارق صدیقی	مظفر حنفی	۱
صدیق احمد	نثار احمد	۱	سعادت علی صدیقی	خلیق انجم	۱
صدیق مجیبی	مظفر حنفی	۲	ظہیر احمد صدیقی	خلیق انجم	۱
صدیقہ بیگم	خلیق انجم	۱	" "	ظفر ادیب	۱
آفاق حسین صدیقی	مظفر حنفی	۳	" "	گیان چند جین	۸
امیر احمد صدیقی	مظفر حنفی	۱	" "	کنول ڈبائیوی	۱
حال احمد صدیقی	مظفر حنفی	۱	" "	جگن ناتھ آزاد	۴
رشید احمد صدیقی	خلیق انجم	۱۵	" "	سعادت علی صدیقی	۲
" "	نثار احمد فاروقی	۵۳	عبدالستار صدیقی	نثار احمد فاروقی	۲
" "	ظفر ادیب	۲	کیف احمد صدیقی	مظفر حنفی	۲
" "	امریک آنند	۲	محمد اسرائیل صدیقی	نثار احمد فاروقی	۲
" "	مہیش چندر نقش	۱	محمد اکبر الدین صدیقی	خلیق انجم	۱
" "	آل احمد سرور	۱	محمد شمس الدین صدیقی	خلیق انجم	۶
" "	مختار الدین احمد	۱	محمد عادل صدیقی	نثار احمد فاروقی	۱
" "	ساغر نظامی	۱	محمد علی صدیقی	خلیق انجم	۲
" "	وجاہت علی سندیلوی	۳	" "	نثار احمد فاروقی	۱
" "	رام لعل نابھوی	۱	محمد ثقلین اشرف صدیقی	مظفر حنفی	۱
" "	گیان چند جین	۱۳	مظہر الدین احمد صدیقی	خلیق انجم	۱
" "	سلطان احمد صدیقی	۱	صغرا مہدی	مظفر حنفی	۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
صفدر آہ	خلیق انجم	۴	وشوا ناتھ طاؤس	پریم پال اشک	۱
صفدر حسین	خلیق انجم	۱	〃 〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۲
صمد حیدری	ظفر ادیب	۴	〃 〃 〃	ظفر ادیب	۱
ضامن مراد آبادی	خلیق انجم	۲	کرشن کمار طور	ظفر ادیب	۳۱
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱	ظ۔ انصاری	خلیق انجم	۲۷
ضمیر حسن	خلیق انجم	۱	〃 〃	عمیق حنفی	۸
ضیاء احمد	خلیق انجم	۱	〃 〃	گیان چند جین	۲۱
ضیاء الدین احمد	خلیق انجم	۱	〃 〃	[illegible] انصاری	۱
ضیاء الدین محمد	خلیق انجم	۱	〃 〃	مظفر حنفی	۳
ضیا عظیم آبادی	خلیق انجم	۱	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱
〃 〃	مظفر حنفی	۱	〃 〃	اطہر فاروقی	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۳	ظفر احمد	خلیق انجم	۱
〃 〃	اوم پرکاش بجاج	۲۰	〃 〃	ظفر ادیب	۱
〃 〃	حمیدہ سلطان	۱	ظفر ادیب (کانپور)	ظفر ادیب	۱
〃 〃	گیان چند جین	۲	ظفر ادیب (دہلی)	جگن ناتھ آزاد	۴
〃 〃	دلیپ بادل	۱	〃 〃 〃	حمیدہ سلطان	۱
طارق کفایت	ظفر ادیب	۱	〃 〃 〃	گیان چند جین	۲
محمد عبداللہ طارق دہلوی	نثار احمد فاروقی	۳	〃 〃 〃	حکیم عبدالحمید	۱
طالب چکوالی	پریم پال اشک	۱	ظفر اقبال	مظفر حنفی	۳
طالب کاشمیری	ظفر ادیب	۲	مرزا ظفر الحسن	خلیق انجم	۱
وشوا ناتھ طاؤس	خلیق انجم	۲۴	〃 〃	راج بہادر گوڑ	۲۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
مرزا ظفر الحسن	جگن ناتھ آزاد	۱	عارف انجم	پریم پال اشک	۱
ظفر ہاشمی	مظفر حنفی	۱	عارف نقشبندی	ظفر ادیب	۱
ظہور الحسن	ظفر ادیب	۲	مرزا عبدالمجید عاشق	ظفر ادیب	۱
ظہور الدین	ظفر ادیب	۱	عاشور کاظمی	خلیق انجم	۱۳
سید ظہیر الحسن	مظفر حنفی	۱	توصیف علوی عاصی	ظفر ادیب	۱
عابد پشاوری	خلیق انجم	۴	شیخ عبدالبصیر عاصی	مظفر حنفی	۲
عابد حسین	عزیز سیدین	۱	دھرم پال عاقل	پریم پال اشک	۳
" "	جگن ناتھ آزاد	۳	عالم تاجپوری	مظفر حنفی	۱
" "	این۔ ایل۔ بھٹ	۱	جمیل الدین عالی	نثار احمد فاروقی	۴
" "	گیان چند جین	۱	جمیل الدین عالی	خلیق انجم	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۳	عامر انصاری	نثار احمد فاروقی	۱
" "	سید شہاب الدین دسنوی	۱۱	خواجہ احمد عباس	صالحہ عابد حسین	۲
سید عابد علی عابد	ظفر ادیب	۱	" " "	عابد حسین	۱
عابد علی خاں	خلیق انجم	۳۵	" " "	رضا اشک	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۷	عبدالباقی	مظفر حنفی	۹
" "	نثار احمد فاروقی	۳	مولوی عبدالحق	ہادی نقشبندی	۱
" "	گیان چند جین	۳	" "	رخشاں ابدالی	۵
" "	حمیدہ سلطان	۱	" "	منشی شاکر حسین نکہت سہوانی	۱
" "	مالک رام	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۱
" "	ظہیر احمد صدیقی	۱	" "	آفاق صدیقی	۴
عادل ادیب	مظفر حنفی	۷	" "	عابد حسین	۳۷
عارف جلال	مظفر حنفی	۴	" "	سید مسعود حسن رضوی	۲۰

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
حکیم عبدالحمید	خلیق انجم	۳	قاضی عبدالودود	خلیق انجم	۹
〃 〃	ظفر ادیب	۱	〃 〃	مہیش پرشاد	۲
قاضی عبدالستار	خلیق انجم	۱	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱۰۷
عبدالسلام	ظفر ادیب	۷	〃 〃	ظفر ادیب	۱۵
عبدالشکور	نثار احمد فاروقی	۳	〃 〃	کمال جعفری	۱
عبدالعلی	نثار احمد فاروقی	۱	〃 〃	گیان چند جین	۱
عبدالماجد دریابادی	وجاہت علی سندیلوی	۱	〃 〃	سید مسعود حسن رضوی	۲۵
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱۱	〃 〃	حمیدہ سلطان	۲۷
〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	۱	〃 〃	رشید حسن خاں	۴۶
〃 〃	سلام سندیلوی	۱	〃 〃	امیر حسن عابدی	۱
عبدالمغنی	خلیق انجم	۹۷	〃 〃	سلام سندیلوی	۲
〃 〃	مظفر حنفی	۱	〃 〃	گوپال متل	۰۱
〃 〃	واحد پریمی	۱	〃 〃	اکبر حیدری کاشمیری	۴
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۱	عبداللہ کمال	خلیق انجم	۴
〃 〃	چیرمین ساہتیہ اکیڈمی	۱	عبدالرحمٰن	خلیق انجم	۱
〃 〃	پی. وی. نرسمہا راؤ	۱	عتیق احمد عتیق	مظفر حنفی	۲
〃 〃	سرجیت سنگھ برنالہ	۱	عتیق صدیقی	خلیق انجم	۱۱
〃 〃	راجیو گاندھی	۱	〃 〃	آنند نرائن ملا	۲
〃 〃	شاہد ماہلی	۱	〃 〃	نثار احمد فاروقی	۹
〃 〃	فہمیدہ بیگم	۲	محمد واصل عثمانی	مظفر حنفی	۲
عبدالوحید	مظفر حنفی	۱	معین الدین عثمانی	مظفر حنفی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
عبدالحمید عدم	ظفر ادیب	۱	عزیز انصاری	مظفر حنفی	۱
عرش ملسیانی	جگن ناتھ آزاد	۱	عزیز تمنائی	نثار احمد فاروقی	۱
" "	سرداری لال نشتر	۲	عزیز وارثی	ظفر ادیب	۲
امتیاز علی خاں عرشی	خلیق انجم	۱۷	عشرت جلال	مظفر حنفی	۱
" " "	ظفر ادیب	۴	عشرت ظفر	مظفر حنفی	۱
" " "	آل احمد سرور	۱۲	عشرت قادری	مظفر حنفی	۴
" " "	حفیظ الدین	۳	عشرت کرتپوری	ظفر ادیب	۵
" " "	نثار احمد فاروقی	۵۵	عطاء اللہ پالوی	پریم پال اشک	۱
" " "	گوپی چند نارنگ	۱	عظیم فیروزآبادی	خلیق انجم	۱
" " "	اسلم پرویز	۱	معین الدین عقیل	خلیق انجم	۱
" " "	رشید حسن خاں	۲۴	عقیل ہاشمی	نثار احمد فاروقی	۴
" " "	ساغر نظامی	۱	علقمہ شبلی	مظفر حنفی	۱
" " "	سید شہاب الدین دسنوی	۱	تنویر احمد علوی	خلیق انجم	۳۲
" " "	حمیدہ سلطان	۶	" "	مظفر حنفی	۱
" " "	سلام سندیلوی	۵	" "	گیان چند جین	۱۶
" " "	گیان چند جین	۵	" "	سلطانہ بخش	۱
عرفی آفاقی	ظفر ادیب	۱	" "	صالحہ عابد حسین	۱
عروج زیدی	مظفر حنفی	۳	علی احمد	مظفر حنفی	۱
عزیز احمد	خلیق انجم	۳	علی افسر	نثار احمد فاروقی	۱
عزیز اندوری	خلیق انجم	۱	علیم صبا نویدی	مظفر حنفی	۱
" "	مظفر حنفی	۱	عمیق حنفی	وزیر آغا	۳
" "	پریم پال اشک	۲	" "	ظ۔ انصاری	۱

خط	بہ نام	تعداد
عمیق حنفی	نثار احمد فاروقی	۲
" "	خلیق انجم	۲
عندلیب شادانی	حمیدہ سلطان	۷
عنوان چشتی	خلیق انجم	۹
" "	ظفر ادیب	۲
" "	مظفر حنفی	۲
" "	جگن ناتھ آزاد	۴
" "	گیان چند جین	۷
" "	محمود سعیدی	۲
عابد اللہ غازی	خلیق انجم	۲
خواجہ غلام السیدین	ظفر ادیب	۱
" " "	ہادی نقشبندی	۱
غلام حسین قیصر	ظفر ادیب	۱
غلام رسول مہر	عتیق صدیقی	۱
شبیر احمد غوری	خلیق انجم	۱
فاروق حیدر	خلیق انجم	۱
فاروق شفق	مظفر حنفی	۱۰
فاروق عندلیب	مظفر حنفی	۴
خواجہ احمد فاروقی	خلیق انجم	۲۵
" " "	راج نرائن راز	۱
" " "	قاضی عبدالغفار	۳۵

خط	بہ نام	تعداد
خواجہ احمد فاروقی	آل احمد سرور	۱۰
" " "	گیان چند جین	۱۸
" " "	صالحہ عابد حسین	۳
" " "	نثار احمد فاروقی	۱
" " "	عبدالمغنی	۱
شمس الرحمٰن فاروقی	خلیق انجم	۵
" " "	ظفر ادیب	۱
" " "	مظفر حنفی	۹
" " "	نثار احمد فاروقی	۲
" " "	عمیق حنفی	۳۲
" " "	گیان چند جین	۲۳
" " "	اطہر فاروقی	۱
" " "	جگن ناتھ آزاد	۲
محمد حسن فاروقی	ساحر ہوشیارپوری	۱
نثار احمد فاروقی	خلیق انجم	۴۸
" " "	مظفر حنفی	۵
" " "	گیان چند جین	۱۹
" " "	امتیاز علی تاج	۱
" " "	کالی داس گپتا رضا	۱
فاضل زیدی	خلیق انجم	۷
علی احمد فاطمی	خلیق انجم	۲

خط	بہ نام	تعداد
کلب علی خاں فائق	خلیق انجم	۲
وتستہ پرشاد فدا	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
فراق گورکھپوری	خلیق انجم	۹
〃 〃	ظفر ادیب	۷
〃 〃	ہمت رائے شرما	۲
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱۰
〃 〃	گیان چند جین	۷
〃 〃	سلام سندیلوی	۶
〃 〃	ساحر ہوشیارپوری	۷
فرخندہ جمال	مظفر حنفی	۱
فردوس حیدر	خلیق انجم	۱
فردوس فاطمہ نصیر	خلیق انجم	۱
فرمان فتح پوری	خلیق انجم	۴۶
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
〃 〃	مظفر حنفی	۳
〃 〃	گیان چند جین	۲
〃 〃	ضیاء الحق	۱
〃 〃	تنویر احمد علوی	۱
〃 〃	رضوان احمد	۱
〃 〃	انصار اللہ نظر	۱
〃 〃	مسعود حسین خاں	۱

خط	بہ نام	تعداد
فرمان فتح پوری	مالک رام	۱
〃 〃	رشید حسین خاں	۱
〃 〃	گوپی چند نارنگ	۱
خواجہ حمید فریدی	نثار احمد فاروقی	۱
فصیح اکمل	خلیق انجم	۱
فضا ابن فیضی	عبدالمغنی	۳
〃 〃	مخمور سعیدی	۲
〃 〃	مظفر حنفی	۳
فضا کوثری	مظفر حنفی	۷
فضل الحق	نثار احمد فاروقی	۱
فضل الرحمٰن	خلیق انجم	۴
فضل امامؔ	مظفر حنفی	۴
فقیر سکلے	خلیق انجم	۱
فیروز نظر	ظفر ادیب	۱
فیض احمد فیض	گوپی چند نارنگ	۱
〃 〃	حمیدہ سلطان	۲
〃 〃	قدسیہ بیگم	۴
〃 〃	شمع زیدی	۱
〃 〃	دیوان تصور	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۱
〃 〃	ساحر ہوشیارپوری	۱

خط	بہ نام	تعداد
فیض احمد فیض	صبا لکھنوی	۱
حامد حسن قادری	خلیق انجم	۱
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۴
عتیق احمد قاسمی	نثار احمد فاروقی	۱
قاضی الاسلام	نثار احمد فاروقی	۱
قاضی سلیم	عمیق حنفی	۲۰
قائد حسین کوثر	مظفر حنفی	۱
قتیل شفائی	ظفر ادیب	۳
قتیل مرادآبادی	مظفر حنفی	۱
بیگم انیس قدوائی	خلیق انجم	۴
صدیق الرحمٰن قدوائی	شریف الحسن نقوی	۱
〃 〃 〃	خلیق انجم	۱
قرۃ العین حیدر	خلیق انجم	۵
〃 〃	ظفر ادیب	۱
〃 〃	گیان چند جین	۵
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۱
〃 〃	صالحہ عابد حسین	۲
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۴
شاہ نواز قریشی	مظفر حنفی	۲
ظہیر مسعود قریشی	خلیق انجم	۱
عبدالرزاق قریشی	خلیق انجم	۱۵
قمر احسن	مظفر حنفی	۳
دیوان پنڈی داس قمر	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
قمر رئیس	خلیق انجم	۱۳
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۲
〃 〃	گیان چند جین	۱۵
〃 〃	کنول ڈبائیوی	۹
〃 〃	ظفر ادیب	۱
〃 〃	عمیق حنفی	۳
قمر مشتاق	مظفر حنفی	۱
قمر ہوشیارپوری	طوفان	۱
کاظم علی خاں	خلیق انجم	۲۹
〃 〃	شریف الحسن نقوی	۱
〃 〃	کنول ڈبائیوی	۱
〃 〃	ظفر ادیب	۲
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	۲
کامل قریشی	خلیق انجم	۴
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۳
〃 〃	مظفر حنفی	۲
کاوش بدری	مظفر حنفی	۴
〃 〃	خلیق انجم	۵
〃 〃	نثار احمد فاروقی	۵

خط	بہ نام	تعداد
کاوش بدری	رام پرکاش راہی	۱
محمد اویس کاوش	مظفر حنفی	۱
کرشن چندر	خلیق انجم	۴
" "	ظفر ادیب	۲
" "	فکر تونسوی	۱
" "	ساحر ہوشیارپوری	۱۹
" "	حکیم منظور محمد قریشی	۲
" "	راج بہادر گوڑ	۵
کرشن موہن	ظفر ادیب	۱
کریم الاحسانی	ظفر ادیب	۲۴
کشمیری لال ذاکر	ظفر ادیب	۴۱
کلام حیدری	خلیق انجم	۲
کلیم الدین شمس	مظفر حنفی	۱
کمار پاشی	عمیق حنفی	۱۱
کنور محمد اشرف	مفتی عتیق الرحمن	۱
کنول ڈبائیوی	نثار احمد فاروقی	۱
" "	پریم پال اشک	۱
کنہیا لال	ظفر ادیب	۱
کوثر چاندپوری	خلیق انجم	۳
" "	مظفر حنفی	۳
" "	ظفر ادیب	۳
کوثر قریشی	ظفر ادیب	۱
مہر چند کوثر	ظفر ادیب	۹
کیفی اعظمی	خلیق انجم	۱
پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی	ساحر ہوشیارپوری	۱
" "	ظفر ادیب	۲
کیول دھیر	مظفر حنفی	۳
آئی۔کے۔ گجرال	خلیق انجم	۲
" " "	جگن ناتھ آزاد	۱
گلزار دہلوی	خلیق انجم	۱
" "	مظفر حنفی	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۲
گوردیال سنگھ والیہ	ظفر ادیب	۱
نظام الدین گوریکر	خلیق انجم	۱
راج بہادر گوڑ	خلیق انجم	۵۰
" "	جگن ناتھ آزاد	۸
" "	آنند نرائن ملا	۲
" "	گیان چند جین	۱
" "	مرزا ظفر الحسن	۱
" "	عبدالمغنی	۱
" "	صالحہ عابد حسین	۱
" "	شریف الحسن نقوی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
راج بہادر گوڑ	مالک رام	٢	مالک رام	عبد المغنی	٣
گوہر ندیم	ظفر ادیب	١	〃 〃	گوپی چند نارنگ	١٢
مسز پی نواس لاہوٹی	خلیق انجم	١٤٥	مانک ٹالا	ظفر ادیب	٢
〃 〃 〃	گوپی چند نارنگ	١	ماہر القادری	نثار احمد فاروقی	١
〃 〃 〃	سید شہاب الدین دسنوی	١	〃 〃	جگن ناتھ آزاد	١
〃 〃 〃	جگن ناتھ آزاد	٤	پریم گوپال متل	ظفر ادیب	١
〃 〃 〃	گیان چند جین	٣	〃 〃 〃	مظفر حنفی	٧
〃 〃 〃	مالک رام	١	مجاز نوری	مظفر حنفی	١
〃 〃 〃	صالحہ عابد حسین	١	مجاہد حسین حسینی	مظفر حنفی	١
〃 〃 〃	ظفر ادیب	٢	مجتبیٰ حسین	خلیق انجم	٣
لطف اللہ خاں	نثار احمد فاروقی	١	〃 〃	نثار احمد فاروقی	٢
لطیف الزماں خاں	خلیق انجم	١	〃 〃	مظفر حنفی	١
ماجد علی خاں	خلیق انجم	١	مجروح سلطان پوری	خلیق انجم	١
مالک رام	خلیق انجم	١١	مجنوں گورکھپوری	خلیق انجم	٢
〃 〃	ظفر ادیب	٦	مجیب خیرآبادی	خلیق انجم	١
〃 〃	نثار احمد فاروقی	٢٩	محبوب یار جنگ	نثار احمد فاروقی	١
〃 〃	حنیف نقوی	٢	محبوب علی مظہر	مظفر حنفی	١
〃 〃	گیان چند جین	٥٠	محبوب راہی	مظفر حنفی	٤٨
〃 〃	ہمت رائے شرما	٣	〃 〃	گوپی چند نارنگ	١
〃 〃	جگن ناتھ آزاد	١٠	تلوک چند محروم	ظفر ادیب	٢
〃 〃	سرور تونسوی	١	〃 〃 〃	سمن سرحدی	١

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
محمد اسلم	نثار احمد فاروقی	۳	محمد رضا	خلیق انجم	۱
محمد اسلم فرخی	خلیق انجم	۱	حکیم محمد سعید	نثار احمد فاروقی	۵
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	خلیق انجم	۲	محمد صابرین	خلیق انجم	۱
" " "	ظفر ادیب	۱	محمد طفیل	خلیق انجم	۱۹
محمد امین انصاری	مظفر حنفی	۱	" "	ظفر ادیب	۲
محمد انصار اللہ	گیان چند جین	۲۶	" "	مظفر حنفی	۱
" "	شاہد ماہلی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۹
محمد بن علی	نثار احمد فاروقی	۱	" "	گیان چند جین	۳۱
محمد حسن	خلیق انجم	۹	" "	جگن ناتھ آزاد	۲
" "	آنند نرائن مُلّا	۱	" "	اکبر حیدری کاشمیری	۱
" "	رفعت سروش	۱	" "	عبد المغنی	۴
" "	مظفر حنفی	۲	" "	صالحہ عابد حسین	۳
" "	گیان چند جین	۳۲	" "	رضوان اللہ اروی	۱
" "	عمیق حنفی	۱	" "	اخلاق اثر	۱
" "	ظفر ادیب	۵	محمد عثمان	مظفر حنفی	۱
" "	عبد المغنی	۲	قاضی محمد عدیل عباسی	آل احمد سرور	۹
" "	جگن ناتھ آزاد	۲	" " "	خلیق انجم	۳
" "	کنول ڈبائیوی	۲	سید محمد عقیل	خلیق انجم	۱
محمد حفیظ الدین	امتیاز علی عرشی	۷	محمد علوی	عمیق حنفی	۱۱
" "	سید حامد حسین جیلانی	۱	محمد فخر الدین	مظفر حنفی	۱
محمد خالد عابدی	مظفر حنفی	۱	محمد مجیب	سید مسعود حسن رضوی	۱

خط	بہ نام	تعداد
محمد مجیب	عابد حسین	۱
" "	بیگم آصفہ مجیب	۱
محمد مجیب الرحمٰن	نثار احمد فاروقی	۱
محمد محمود احمد	خلیق انجم	۱
محمد مرغوب الزماں	خلیق انجم	۱
محمد منظور احمد	خلیق انجم	۹
" "	نثار احمد فاروقی	۲۹
" "	مظفر حنفی	۱
محمد ناصر کمال	مظفر حنفی	۱
محمد نعمان خاں	مظفر حنفی	۲
محمد یعقوب	ظفر ادیب	۲
" "	مظفر حنفی	۲
محمد یوسف	مظفر حنفی	۵
محمود الحسن	آل احمد سرور	۱
محمود الٰہی	خلیق انجم	۴
محمود قمر	نثار احمد فاروقی	۱
محمود ہاشمی	مظفر حنفی	۳
" "	عمیق حنفی	۲۰
" "	گیان چند جین	۲
محی الدین کاظمی	مظفر حنفی	۱
مختار الدین احمد	خلیق انجم	۹
مختار الدین احمد	نثار احمد فاروقی	۴۵
" " "	گیان چند جین	۷
" " "	شاہد ماہلی	۱
" " "	جگن ناتھ آزاد	۱
" " "	سید مسعود حسن رضوی	۱
مخدوم محی الدین	قدسیہ بیگم	۱
" " "	راج بہادر گوڑ	۱
مخمور سعیدی	مظفر حنفی	۳
" "	نثار احمد فاروقی	۱
" "	انور صدیقی	۱
" "	طارق صدیقی	۱
" "	اطہر فاروقی	۱
" "	انیس احمد	۲
" "	خلیق انجم	۱
" "	ظفر ادیب	۱
مدحت الاختر	مظفر حنفی	۱۲
مرزا ادیب	خلیق انجم	۱
مسعود حسن رضوی	پریم پال اشک	۱
مسعود حسین خاں	خلیق انجم	۴۴
" " "	ظفر ادیب	۵
" " "	آل احمد سرور	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
مسعود حسین خاں	نثار احمد فاروقی	۱۲	مشفق خواجہ	جگن ناتھ آزاد	۲
" " "	گیان چند جین	۲۶	مصطفےٰ مومن	مظفر حنفی	۲
" " "	صالحہ عابد حسین	۱	مصلح الدین سعدی	نثار احمد فاروقی	۱
" " "	ایم. حبیب خاں	۲	مصور سبزواری	مظفر حنفی	۳
" " "	ساحر ہوشیارپوری	۱	رام رتن	مضطر	۲
مسعود عابدی	مظفر حنفی	۴	مضطر مجاز	نثار احمد فاروقی	۱
مسعود منظر	مظفر حنفی	۲	مظفر الحق	ظفر ادیب	۱
مسلم ضیائی	نثار احمد فاروقی	۱	مظفر حنفی	ظفر ادیب	۴
مسیح الزماں	خلیق انجم	۱	" "	خلیق انجم	۴
مشفق خواجہ	خلیق انجم	۳۱	" "	عمیق حنفی	۱۴
" "	ظفر ادیب	۱	" "	گیان چند جین	۲
" "	نثار احمد فاروقی	۳	" " "	نثار احمد فاروقی	۶
" "	مظفر حنفی	۹	مظہر امام	خلیق انجم	۲
" "	پریم پال اشک	۱	" "	مظفر حنفی	۴
" "	گیان چند جین	۱۰	" "	جگن ناتھ آزاد	۱
" "	ضامن مرادآبادی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۳
" "	عبدالمغنی	۱	" "	عمیق حنفی	۳
" "	اسلم پرویز	۱	مظہر علوی	خلیق انجم	۱
" "	تنویر احمد علوی	۱	مظہر محی الدین	خلیق انجم	۱
" "	ظہیر احمد صدیقی	۱	معراج الدین	خلیق انجم	۱
" "	رشید حسن خاں	۲	معصوم شرقی	مظفر حنفی	۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
معین اعجاز	مظفر حنفی	۱	مودود صدیقی	مظفر حنفی	۱
سید معین الرحمن	خلیق انجم	۴	سلامت علی مہدی	خلیق انجم	۵
باوا کرشن گوپال مخمور	ظفر ادیب	۴	مہدی نظمی	مظفر حنفی	۱
" " "	خلیق انجم	۱۲	" "	خلیق انجم	۵
" " "	مخمور سعیدی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۱
مغنی تبسم	خلیق انجم	۱	مہر بخشی	پریم پال اشک	۱
مفتون کوٹوی	ظفر ادیب	۱	مہر جہاں	نثار احمد فاروقی	۱
م۔ ق۔ خاں	مظفر حنفی	۲	مہندر ناتھ	ساحر ہوشیارپوری	۲
مقصود احمد مکی	خلیق انجم	۱	مرزا ادیب	خلیق انجم	۷
آنند نرائن مُلا	عبدالمغنی	۲	" "	جگن ناتھ آزاد	۴
" " "	خلیق انجم	۱	میر معظم حسین	نثار احمد فاروقی	۱
" " "	ایم۔ زیڈ۔ رحمان خاں	۱	میکش اکبرآبادی	خلیق انجم	۵
ملک زادہ منظور احمد	خلیق انجم	۱	" " "	نثار احمد فاروقی	۳
ممتاز حسن جونپوری	پریم پال اشک	۲	رام لال نابھوی	خلیق انجم	۱۰۹
مناظر عاشق ہرگانوی	مظفر حنفی	۱	" "	ظفر ادیب	۹
منشاء الرحمن خاں منشا	مظفر حنفی	۲	نادم سیتاپوری	نثار احمد فاروقی	۱۱
منظر اعظمی	خلیق انجم	۲	گوپی چند نارنگ	خلیق انجم	۱۹
منظر کاظمی	مظفر حنفی	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۲
منور رانا	مظفر حنفی	۴	" "	مظفر حنفی	۷
" "	شنوان چشتی	۱	" "	ظفر ادیب	۲
منوہر راج سکسینہ	خلیق انجم	۱	" "	مخمور سعیدی	۱

خط	بہ نام	تعداد
گوپی چند نارنگ	پریم پال اشک	۱
" "	گیان چند جین	۵۲
" "	جگن ناتھ آزاد	۲
" "	کنول ڈبائیوی	۱
" "	عبدالمغنی	۱
" "	اطہر فاروقی	۱
نازانصاری	ظفر ادیب	۱
نارش پرتاپ گڑھی	مظفر حنفی	۲
" " "	بلقیس شبیہ	۱
" " "	جگن ناتھ آزاد	۸
" " "	گیان چند جین	۱
" " "	عرفان زیدی	۱
" " "	صالحہ عابد حسین	۴
ناصر احمد پرواری	پریم پال اشک	۱
ناصر زیدی	خلیق انجم	۲
سید ابوالکلام حکیم ناطق لکھنوی	ساحر ہوشیارپوری	۱
ناظم سلطان پوری	مظفر حنفی	۱
نامی انصاری	مظفر حنفی	۲۴
" "	ظ۔ انصاری	۱
ناوک حمزہ پوری	مظفر حنفی	۴

خط	بہ نام	تعداد
نبی احمد	پریم پال اشک	۱
نجم الاسلام ہاشمی	مظفر حنفی	۱
نجم الہدیٰ	خلیق انجم	۱
نجم عثمانی	مظفر حنفی	۱
ندرت میرٹھی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۱
عبدالسلام ندوی	سید مسعود حسن رضوی	۱
نجیب اشرف ندوی	خلیق انجم	۳
" " "	نثار احمد فاروقی	۹
" " "	گیان چند جین	۹
" " "	رشید حسن خاں	۳
نذیر احمد	خلیق انجم	۱
نذیر فتحپوری	مظفر حنفی	۴
نزہت پروین	مظفر حنفی	۱
نشتر خانقاہی	مظفر حنفی	۱
سرداری لال نشتر	پریم پال اشک	۴
عبدالرحیم نشتر	خلیق انجم	۱
نشور واحدی	خلیق انجم	۱
" "	ظفر ادیب	۱
خلیق الزماں نصرت	مظفر حنفی	۲
نظام الدین الیاس گوریکر	خلیق انجم	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
نظام الدین نظام	مظفر حنفی	۲	عبد المتین نیاز	مظفر حنفی	۱
خلیق احمد نظامی	خلیق انجم	۱	نیاز فتحپوری	خلیق انجم	۴
" " "	نثار احمد فاروقی	۲۰	" "	ظفر ادیب	۱
نظر اٹیوی	مظفر حنفی	۱	" "	سرور تونسوی	۶
نظر برنی	خلیق انجم	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۳۰
نظیر رشیدی	مظفر حنفی	۱	" "	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱
نعمان شوق	مظفر حنفی	۱	" "	وقار احمد رضوی	۴
نعیم اشفاق	مظفر حنفی	۲	" "	رشید حسن خاں	۱
نقش نیاز	ظفر ادیب	۱	" "	سلام سندیلوی	۱
شریف الحسن نقوی	نثار احمد فاروقی	۲	حکم چند نیر	مظفر حنفی	۱
" " "	خلیق انجم	۵	" "	نثار احمد فاروقی	۱
ناصر حسین نقوی	خلیق انجم	۲	" "	خلیق انجم	۴
نور الحسن نقوی	نثار احمد فاروقی	۴	" "	جگن ناتھ آزاد	۶
نوح ناروی	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۱	" "	گیان چند جین	۱۵
نور الاسلام	نثار احمد فاروقی	۱	" "	عبد المغنی	۱
نور السعید اختر	خلیق انجم	۱	" "	ظفر ادیب	۱
امیر حسن نورانی	پریم پال اشک	۱	صلاح الدین نیر	نثار احمد فاروقی	۱
" "	نثار احمد فاروقی	۳	نسیم احمد نیر	مظفر حنفی	۱
نور تقی نور	ظفر ادیب	۴	واجد سحری	خلیق انجم	۲
علیم صبا نویدی	مظفر حنفی	۱	واحد پریمی	خلیق انجم	۲
سید نیاز احمد	مظفر حنفی	۱	واسدیو	پریم پال اشک	۲

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
حفیظ الرحمٰن واصف	خلیق انجم	۲	وفا ملک پوری	ظفر ادیب	۴
والی آسی	مظفر حنفی	۱	وقار خلیل	خلیق انجم	۴
وامق جونپوری	جگن ناتھ آزاد	۱	" "	نثار احمد فاروقی	۴
" "	راج بہادر گوڑ	۱	" "	ظفر ادیب	۱
وجاہت علی سندیلوی	خلیق انجم	۲	" "	کنول ڈبائیوی	۱
سکندر علی وجد	خلیق انجم	۱	" "	جگن ناتھ آزاد	۱
" "	خلیق انجم	۱	وقار واثق	مظفر حنفی	۱
" "	رشید حسن خاں	۳	ویریندر پرشاد سکسینہ	پریم پال اشک	۲
وحید اختر	خلیق انجم	۲	ہارون ایوب	ظفر ادیب	۳
وحید قریشی	خلیق انجم	۹	ہاشم افگار	مظفر حنفی	۱
راجیندر سنگھ ورما	خلیق انجم	۲	رفیع الدین ہاشمی	عبدالمغنی	۵
" " "	مظفر حنفی	۱	" " "	خلیق انجم	۳
وریندر وہرہ	ظفر ادیب	۹	نصیر الدین ہاشمی	سید مسعود حسن رضوی	۱
وزیر آغا	خلیق انجم	۳	نور الحسن ہاشمی	خلیق انجم	۲
" "	مظفر حنفی	۱۲	" "	نثار احمد فاروقی	۱
" "	جگن ناتھ آزاد	۹	" "	جگن ناتھ آزاد	۱
" "	رام لال نابھوی	۱	" "	گیان چند جین	۱۴
" "	عمیق حنفی	۲۰	" "	ظفر ادیب	۱
وسیع احمد	خلیق انجم	۱	" "	رشید حسن "	۱
وسیم احمد	مظفر حنفی	۱	" "	آنند نرائن ملا	
دھرم پال گپتا وفا	احسان دانش	۱	" "	سعادت علی صدیقی	۱

خط	بہ نام	تعداد	خط	بہ نام	تعداد
ہربھجن سنگھ تماپر	ظفر ادیب	۱	یوسف حسین خاں	نثار احمد فاروقی	۵
ہرش مہتہ	نثار احمد فاروقی	۴	یوسف سرمست	مظفر حنفی	۳
ہما میرٹھی	خلیق انجم	۱	یوسف ناظم	مظفر حنفی	۶
یعقوب عمر	نثار احمد: روقی	۱	" "	خلیق انجم	۳
یعقوب یاورکوٹی	مظفر حنفی	۳	" "	شاہد ماہلی	۱
یگانہ چنگیزی	سید مسعود حسن رضوی	۸	" "	عمیق حنفی	۱
یوسف سکاری	نثار احمد فار	۳	" "	جگن ناتھ آزاد	۴
ر ع تقی	مظفر حنفی	۱			

غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں

فخرالدّین علی احمد میموریل لیکچر

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیرِ اہتمام فخرالدین میموریل لیکچر کے تحت ایوانِ غالب نئی دہلی میں جمعہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۴ء شام ۶ بجے برّصغیر کے نامور مورّخ اور دانشور پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے "اُنیسویں صدی میں دلّی کے تہذیبی و علمی ماحول" کے عنوان کے تحت ایک عالمانہ خطبہ پیش کیا جس میں نظامی صاحب نے تاریخی دلائل کے ساتھ اُنیسویں صدی میں دلّی کے تہذیبی اور علمی ماحول پر گہری نظر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "تاریخ میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں جب سیاسی زوال اور انتشار کے روح فرسا حالات میں انفرادی صلاحیتوں نے ماحول کے آگے سپر نہیں ڈالا ہے بلکہ فکر و نظر کی نئی دنیا آباد کر دی ہے ... حقیقت یہ ہے کہ عروج میں زوال اور زوال میں عروج کے عناصر، خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں"۔

جلسے میں سامعین نے اس علمی اور ادبی مقالے کو بہت غور سے سُنا اور بے حد داد دی۔ جلسے میں دلّی کے اہم عمائدین کے علاوہ یونی ورسٹی کے اساتذہ، طالب علم کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیئرمین بیگم عابدہ احمد، انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد، خواجہ حسن ثانی نظامی اور جناب بدر دریز احمد بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ پروگرام

کی ابتداء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد نے مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے تعریف فرمائی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے نئے عہدیداران کا انتخاب

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹیز کی ایک اہم میٹنگ گذشتہ یکم ستمبر ۱۹۹۴ء کو صبح ۱۱ بجے ایوانِ غالب نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین بیگم عابدہ احمد صاحبہ نے فرمائی۔ صدر کے علاوہ میٹنگ میں انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد، پرنس مکرّم جاہ، جناب محمد یونس سلیم، جناب محمد شفیع قریشی، جناب سیّد مظفر حسین برنی، جناب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی، جناب کے۔ کے۔ محی الدین، جناب حسن ثانی نظامی، جسٹس خواجہ محمد یوسف اور جناب بدر دُریز احمد نے شرکت فرمائی۔

میٹنگ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مجلس عاملہ کا اگلے تین برسوں کے لیے انتخاب کیا گیا۔ جس کے ممبران کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ بیگم عابدہ احمد	چیرمین
۲۔ پروفیسر نذیر احمد	وائس چیرمین
۳۔ جناب بدر دُریز احمد	سکریٹری
۴۔ جناب سیّد مظفر حسین برنی	ممبر
۵۔ جناب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی	"
۶۔ جناب پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی	"
۷۔ جناب کے۔ کے۔ محی الدین	"
۸۔ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی	"
۹۔ جناب نواب زادہ عماد الدین احمد خاں	"
	"

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

دیوانِ غالب (اردو)		قیمت: ۲۵/=
خاندانِ لوہارو کے شعرا	مرتبہ: حمیدہ سلطان احمد	۴۰/=
مقالاتِ بین الاقوامی غالب سیمینار (اردو) ۱۹۶۹ء	" ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۰/=
" " " (انگریزی) ۱۹۶۹ء	" " " " "	۱۰/=
غزلیاتِ غالب (اردو) انگریزی ترجمہ	مترجم: " " " "	۹۵/=
" " (فارسی) " "	" " " " " "	۸۰/=
سید مسعود حسن رضوی ادیب	مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد	۶/=
سیر المنازل	ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی	۴۵/=
دیوانِ غالب (ہندی)	مرتبہ: نور نبی عباسی	۶۰/=
غالب کے خطوط (چار جلدوں میں)	" ڈاکٹر خلیق انجم	۳۹۰/=
مثنویاتِ غالب	ترجمہ: ڈاکٹر ظ انصاری	۶۰/=
نقدِ قاطع برہان مع ضمائم	مصنف: پروفیسر نذیر احمد	۶۰/=
یادگارِ غالب	" مولانا الطاف حسین حالی	۶۰/=
غالب اور انقلاب ستاون	" ڈاکٹر معین الرحمٰن	۶۰/=
نواب معتمد الدولہ آغا میر	" ڈاکٹر انصار اللہ	۶۰/=
دیوانِ غالب (کشمیری)	ترجمہ: غلام نبی ناظر	۶۰/=
تفہیمِ غالب	مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی	۹۰/=
مومن خاں مومن	" پروفیسر نذیر احمد	۶۰/=
غالب پر چند مقالے	" " " "	۶۰/=
مولانا امتیاز علی عرشی	" " " "	۶۰/=
قاضی عبدالودود	" " " "	۶۰/=
حافظ محمود شیرانی	" " " "	۶۰/=

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲—۱۱

غالب انسٹی ٹیوٹ کا مجلّہ

غالب نامہ

مدیر اعلا : پروفیسر نذیر احمد
مدیران : رشید حسن خاں، پروفیسر عبدالودود، شاہد ماہلی

اردو میں ادبی تحقیق اور تنقید کی رفتار کا آئینہ

شمارہ	صفحات	قیمت
پہلا اور دوسرا مشترک شمارہ	۳۲۰	۲۰/-
تیسرا اور چوتھا مشترک شمارہ	۱۸۸	۱۰/-
جنوری ۱۹۸۱ء	۲۵۲	۲۵/-
جولائی ۱۹۸۱ء	۳۲۰	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۲ء	۲۸۴	۳۰/-
جولائی ۱۹۸۲ء	۳۲۰	۲۵/-
جنوری ۱۹۸۳ء	۲۴۸	۳۰/-
جولائی ۱۹۸۳ء	۲۲۴	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۴ء	۲۱۶	۳۰/-
جولائی ۱۹۸۴ء	۲۸۸	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۵ء	۱۵۲	۳۰/-
جولائی ۱۹۸۵ء (مومن نمبر)	۲۵۶	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۶ء	۲۳۲	۳۰/-
جولائی ۱۹۸۶ء	۲۲۴	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۷ء (قاضی عبدالودود نمبر)	۳۳۲	۴۰/-
جولائی ۱۹۸۷ء	۲۳۶	۳۰/-
جنوری ۱۹۸۸ء	۲۳۶	۴۰/-
جولائی ۱۹۸۸ء	۲۸۸	۴۰/-
جنوری ۱۹۸۹ء	۲۴۸	۴۰/-
جولائی ۱۹۸۹ء	۲۴۸	۴۰/-
جنوری ۱۹۹۰ء	۲۴۸	۴۰/-
جولائی ۱۹۹۰ء (حافظ محمود شیرانی نمبر)	۳۰۸	۴۰/-
جنوری ۱۹۹۱ء	۲۵۶	۴۰/-
جولائی ۱۹۹۱ء	۲۴۸	۴۰/-
جنوری ۱۹۹۲ء عرشی نمبر	۳۰۰	۵۰/-
جولائی ۱۹۹۲ء	۳۰۸	۵۰/-
جنوری ۱۹۹۳ء (مسعود حسن رضوی نمبر)	۳۴۰	۵۰/-
جولائی ۱۹۹۳ء		۵۰/-

فی شمارہ : ۵۰ روپے   زر سالانہ : سَو روپے

ملنے کا پتہ : غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Ghalibnama

Chief Editor :
PROF. NAZIR AHMAD

Editors :
RASHEED HASAN KHAN
PROF. ABDUL WADOOD AZHAR
SHAHID MAHULI

GHALIB INSTITUTE
AIWAN-E-GHALIB MARG, (MATA SUNDRI LANE)
NEW DELHI-110 002.